

بعونہ تعالیٰ

نیرنگ خیال

حصہ دویم

از

شمس العلماء مولانا مولوی محمد حسین صاحب آزاد مرحوم

سابق پروفیسر عربی گورنمنٹ کالج لاہور

حسبِ فرمائش

آغا محمد طاہر نبیرۂ حضرت آزاد مرحوم

پروپرائٹر آزاد بک ڈپو کوچہ چیلان دہلی

قیمت ۱۲ ؍

فہرست مطالب

مضمون

دیباچہ

تمہید

جنّت الحمقا

خوش طبعی

نکتہ چینی

مرقع خوش بیانی

سیر عدم

بقائے دوام

مطبوعہ ہمدرد و برقی پریس دہلی۔

دیباچہ

اگرچہ خیالات کے جلسے جمے ہوئے ہیں اور اشخاص تصوری زبانہائے بے اجسام سے طلسم کاری کر رہے ہیں۔ سنو کے قریب صفحے سیاہ ہو چکے۔ اب جلسہ ختم اور کچھ عرصے کے لئے کلام کا دروازہ بند۔ اے اہل انجمن! آپ کا آنا مبارک۔ قدم بر چشم۔ مگر جلسہ آئندہ کیلئے ابھی سے گذارش قبول ہو کہ حصہ دویم کا سامان بہم پہنچے

آزاد

***

طلسماتِ خیال کے وعدے تھے کہ کاغذ کے پردوں پر نیرنگیِ عالم کے فوٹو اتاریں گے۔ اور قلم کی جادو نگاری سے بے جان لفظوں کی چلتی پھرتی تصویریں بنا کر دکھائیں گے۔ انشاء اللہ پردازی کے تقاضے تھے کہ بساطِ نثر پر نیرنگ خیال کے جلسے جمائیں گے کیونکہ جلسۂ گذشتہ کے اختتام پر محفل آئندہ کے روح افزا بلاوے مبارک سلامت کے نقیبوں نے ہاتھوں ہاتھ اہل انجمن کے کانوں تک فوراً اسے بیشتر پہنچا دئے تھے۔ تاکہ دوسری مجلس کی رونق پہلے سے

دوچند بلکہ سہ چند ہوسکے۔

لو! وہ وقت آگیا کہ عدم کی سرحد سے ملے ہوئے افراد زرق برق کی عبارت آرائیوں کا جامہ پہن کر ایفا کی منزلوں میں گلگشت کریں اور نیرنگِ خیال کی دوسری مجلس جس کا وعدہ حضرت آزاد نے آج سے چالیس سال پیشتر کیا تھا اور ہزاروں آنکھیں نگراں تھیں کہ کب وہ گھڑی آئے اور دھوم دھام سے کاغذ کے وسیع چمن میں خیالات کے بائیسکوپ کے ذریعہ مجلس آراستہ کی جائے تو اب دیکھنا کہ بے تار کی تار برقی کے پیغامبروں نے کس تیزی اور سُرعت سے شائقین کو جمع کیا ہے کہ نظر شماران کے سمیٹنے سے عاجز آگئی ہے۔

اے معزز اہل بزم! آپ کا تشریف لانا سر آنکھوں پر مگر اتنا دھیان ضرور رہے کہ حضرت آزاد نے یہ بزم آرائیاں فقط اس لئے کی تھیں کہ زبان اُردو جو ابھی نظم کی سر بفلک بلندیوں اور تخیلات کی گہری گہری گہرائیوں سے گھبرا کر دامن نثر پر حیران و پریشان کھڑی تھی۔ اس کا قافلہ آگے بڑھایا جائے اور اس کو علوم و فنون کے سنگلاخ میدانوں میں تصنیف و تالیف کے گلزار بنانے کا موقع دیا جائے۔

ٹپکائے کہ جن کے بیجوں نے جگہ جگہ ہندوستان بھر میں گلزار کھلا دئے ہیں۔ جو کبھی خزاں کے ہاتھوں ویران نہ ہوں گے۔

دیکھتے ہو! زمانے نے کیسی کروٹ بدلی ہے۔ زبان اُردو کا قافلہ ان سدابہار گلستاں سے گذرتا اپنا رنگ روپ چمکاتا۔ ایجاد و اختراع کے ملک میں وارد ہوا چاہتا ہے۔ علوم و فنون کی منزلوں سے تالیف و تصنیف کے ذخیروں کا ایک تانتا لگا ہے کہ برابر لدے چلے آتے ہیں۔ اور اب کوئی دم کی بات باقی ہے کہ ہماری رسیلی زبان دنیا کی علمی زبانوں کے برابر کھوے سے کھوا ملا کر کھڑی ہو جائے!

آج جدھر آنکھ اٹھاتے ہیں۔ ادب اُردو کے خزانے بھرپور نظر آتے ہیں۔ نظم کے علم برادروں نے اپنے پُرانے کپڑے اتار کر بطور تبرک زیب صندوق کر دئے ہیں اور نئے نئے پھریرے کہ جن کی ہوا قومی آتشکدوں کو روشن کرتی ہے۔ اپنے جھنڈوں پر عَلَم کئے۔ قافلہ کو کس گھماگھمی سے لئے چلے جاتے ہیں۔ اہلِ نثر نے بھی پہلی شاہراہوں کو کاٹ چھانٹ کر

ایسے اینچ پیچ مارے ہیں کہ جگہ جگہ نئے نئے رستے کہیں سے کہیں جا ملے ہیں، جن پر دات دن سائنس و فلسفہ کی ڈاک بیٹھی ہے۔

اے نثر و انشا پردازی کے پرستارو! اس جلسے کے لئے سامان دعوت اور تکلفاتِ آرائش حضرتِ آزاد نے خود ہی بہم پہنچائے تھے مگر تقدیر کے ہاتھوں اس کا انجام تھا کہ نہ ہوا اور اُن کو عالم بالا سے سلطانِ آسمانی کا پیغام وہاں کی محفل آرائیوں کے لئے آ پہنچا۔ وہ تشریف لے گئے اور یہ نامکمل دفتر خاموشی کے بستوں میں پڑے سو یا کئے۔ اور اب جبکہ اُمیدیں منقطع ہو چکی تھیں تو قضا و قدر کے ہوشیار مال نے وقت کے پانسہ کو مجھ احقر کے نام زبردستی پھینک دیا۔ افسوس کہ میں اس تصور کاری سے عاجز ہوں، اگرچہ اس وقت میرے سامنے پانچ مرقعے موجود ہیں۔ مگر میاں باوا جیسے لفظوں کے خزانے تصرّف میں کہاں ہیں کہ ان کو جگمگاؤں وہ زبان نہیں رکھتا کہ اس کی آب داری سے ان عقلی شعبدوں کو چمکاؤں وہ طرزِ بیان کہاں کہ اس کے اثر سے جادوگری بھر کر سب کو محوِ حیرت کر سکوں۔ علم نہیں رکھتا کہ اس میں مفلس ہوں عقل و دانش سے کوسوں دور بستا ہوں مگر اتنا جانتا ہوں کہ اپنی بساط کے موافق ان سادے اور بربڑاؤ مرضع ادرپر کار

جو ہر نگار زیوروں کو اُلٹا پلٹا ہے اور جہاں تک ممکن ہو سکا ترتیب کے شیرازے میں تالیف کیا ہے اب عجز کے ہاتھوں پر رکھ کر اپنی ناچیز محنت کو اہلِ بزم کے سامنے ادب و احترام سے پیش کرتا ہوں کہ قبولیت کی مُہر ثبت ہو کر ہمیشگی کی سند عطا ہو جائے۔

"نیرنگ خیال" حصہ اوّل کے خاتمہ پر مولانا نے کلام کا دروازہ بند کیا تھا۔ اس وقت نہیں۔ مگر افسوس! اب ضرور ہو گیا۔

اے طرزِ خاص تجھ سے رخصت چاہتا ہوں۔ تجھ کو حضرت آزاد نے افسوں کار بنایا تھا۔ انہیں کے ساتھ جنم لیا۔ انہیں کے ساتھ اٹھ گئی۔ اب تک اُن گلوں سے کسی نے گلدستہ نہیں بنایا۔ نہ بنا سکے گا۔ ان کنایوں سے اشارے کسی نے نہیں کئے نہ ہو سکیں گے۔ رخصت رخصت۔

میرے میاں باوا کے بلاوے پر آنے والو! دعوت قبول ہو کہ وعدہ سچا ٹھہرے۔

دعا کا محتاج

طاہر نبیرہ حضرت آزاد

۲۳ جنوری سنہ ۱۹۲۳ء

نیرنگ خیال

حصّہ دویم

مضمون مفصلہ ذیل ایک مُرقع خاص کی تصویر کا خاکہ ہے

تمہید جس کی صورت اصلی یہ ہے کہ ہم اور ابنائے جنس ہمارے کچھ اپنی غلط فہمی سے اور کچھ کوتاہ اندیشی سے اعمال قبیحہ یا حرکات ناپسندیدہ میں مبتلا ہیں اور باوجودیکہ اس کے حال و مآل کی قباحتوں سے آگاہ ہیں۔ بلکہ اور ہم صورتوں کو ان کے خمیازے بھرتے دیکھتے ہیں۔ پھر بھی کنارہ کش نہیں ہوتے۔ تعجب یہ ہے کہ جب اپنی جگہ بیٹھتے ہیں۔ تو اس ارتکاب کو داخلِ حسن سمجھ کر اس میں افراط اور زیادتی کرنی سرمایۂ فخر سمجھتے ہیں۔ ایک شراب خوار آدمی یاروں میں بیٹھ کر فخریہ بیان کرتا ہے۔ کہ میں کئی کئی بوتلیں برابر اُڑا جاتا ہوں اور حواس میں بالکل فرق نہیں آتا۔ دوسرا اس سے بڑھ کر اُچھلتا ہے کہ میں پانی تک نہیں ملاتا۔ مگر آواز میں اصلاً تغیر نہیں ہوتا۔ اسی طرح ایک عیاش تماشبین اپنی روسیاہیوں کو کہتا ہے اور نہیں شرماتا دوسرا اس میں اپنی شدتیں

اور افراطیس بیان کرتا ہے۔ اور خوشی سے رنگ رُخ چمکاتا ہے۔ ایک دغا باز
منشی یا دیوان غبن کرکے آقا کے گھر کو برباد اور اپنا گھر آباد کرتا ہے اور جو جو
دخل فصل حساب کتاب میں کیئے۔ انہیں مسائل افلاطون کی طرح فخر سمجھتا
ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جیسا کرتے ہیں ویسا بھرتے ہیں۔ مگر خدا جانے وہ
کیا شے ہے جس نے ایسا پردہ غفلت آنکھوں پر ڈال رکھا ہے کہ نہ وہ نہ برائیاں
بُری معلوم ہوتی ہیں۔ نہ اُن سے باز آتے ہیں۔ یہی کوتاہ اندیشی کبھی ایک
غلط فہمی کے لباس میں ظہور پاتی ہے یعنی اکثر اشخاص خاص خاص اُمور میں
اپنے کمال پر مفتخر اور نازاں ہوتے ہیں۔ ہر چند اُمور مذکور بجائے
خود قابل فخر و ناز کے ہیں۔ مگر بشرطیکہ ان میں کمال نصیب ہو فی الحقیقت
اسے غلط فہمی کہنا چاہیئے جو کہ نتیجہ حماقت اور ایک قسم کی کوتاہ اندیشی کا ہے۔
چنانچہ یہ لوگ بھی ابتدا میں ناواقفیت عوام کے سبب سے رونق بازار
پاتے ہیں۔ مگر چند درجے طے کرکے گر پڑتے ہیں۔ اور سخت ندامت اٹھاتے
ہیں۔ افسوس کہ کوئی زمانہ اس قسم کے گناہوں سے خالی نہیں بلکہ روز
بروز حال ابتر نظر آرہا ہے۔ اس لئے یہ مضمون ابنائے جنس کی عبرت
کے لئے ایک استعارہ اور کنایہ کے رنگ میں لکھا جاتا ہے۔ ہر چند یہ رنگ

صورت مضمون کے مُنھ پر ایک باریک نقاب ہے لیکن اگر اہلِ نظر چند ساعت کے لئے نظرِ غور کو تکلیف دیں گے تو یہ استعارے اور کنائے صراحت اور وضاحت کے پہلو میں رکھے ہوئے پائیں گے۔

دل تیرا آپ پردہ ہے دلدار کے لئے
ورنہ کوئی نقاب نہیں یار کے لئے

آزاد

جنّت الحُمقاء

دنیا میں اکثر قباحتیں اور حماقتیں ایسی ہیں کہ ہم سب ان میں آلودہ ہیں۔ مگر معلوم نہیں ہوتیں۔ درحقیقت وہ ہماری رسائی فہم سے بہت اونچے طاق پر رکھی ہیں۔ اور کچھ ایسے ڈھب سے سجائی گئی ہیں کہ ہر بدی عین خوبی نظر آتی ہے۔ لطف یہ ہے کہ وہ آلودگی ہمیں کچھ بُری بھی نہیں معلوم ہوتی بلکہ بجائے اس کے رفع کرنے یا چھپانے کے خود دکھاتے ہیں ور آرزوئیں کرتے ہیں کہ اپنی قباحتوں میں ترقیاں کریں۔ اور انہیں میں ہماری قدردانیاں ہوں چنانچہ سینکڑوں واہیات۔ ہزاروں لغو خیالات نئے مسخراپن ظرافتوں

کے چمن ہیں کہ وہی ہماری تفریح طبع اور خوش دلی کا سرمایہ ہو رہے ہیں اور یہ رنگینیاں ہیں ایسے ایسے رسوں میں رنگین کر کے ابتلائے جنس کے سامنے جلوہ دیتی ہیں کہ ہم بھی انہیں میں نعمت افتخار لیتے ہیں۔ اس فخر بیہودہ اور خیال بے بنیاد کی خوشی میں خدا جانے کیا لطف دیکھا ہے کہ سیانے دنیاداروں نے اس کی دلفریبیوں کا اشارہ کرنے کے لئے ایک لطیف اصطلاح چھانٹی ہے یعنی (جنت الحمقا)

لفظ آخر میں شاید لوگوں کو کچھ غلطی کا خیال ہو اور جو کچھ میں نے کہا انہیں کی نسبت کچھ اور وضع دکھائی دیتی ہو لیکن مجھے اب اس کا امتحان کرنا بیجا ہے۔ کیونکہ میں جو اس وقت آنکھیں مل رہا ہوں۔ تو یہی خواب دیکھ رہا تھا۔

ابھی سوتے سوتے ایسا معلوم ہوا گویا کسی نے مجھے ایک پہاڑ پر پھینک دیا ہے۔ مگر عجیب پہاڑ ہے کہ سبزہ سے لہلہاتا پھولوں سے مہکتا چلا جاتا ہے پانی لہراتا ہے۔ چڑھائی اس کی ہمت بلند کا نمونہ ہے۔ مگر باوجود اس کے اعتدال پر ہے کہ دم نہیں چڑھنے دیتی۔ بلکہ ساعت بہ ساعت سینے کو قوت حاصل ہوتی ہے۔ میں ادھر ادھر پھرنے لگا۔ اتنے میں ایک پہاڑ

کی چوٹی پر پہنچا تو میدان فراخ پایا اور دُور سے نظر آیا کہ ایک جگہ آبِ رواں میں پاؤں لٹکائے کوئی شہزادی بیٹھی ہے کہ زیور اور لباس سے طاؤس مرصع کا عالم ہے۔ مگر آنکھ سے بھینگی ہے اور اس بھینگی آنکھ پر ایک رنگین عینک بھی لگائے ہے کہ اسی سبب سے اسے کوئی شے حالتِ اصلی پر نہیں نظر آتی۔ چنانچہ معلوم ہوا کہ بلکہ غلط فہمی یہی ہے۔ اور کل اہلِ عالم کی غلط فہمی گویا اسی کی نگاہ پر منحصر ہے۔

برابر اس کے ایک عجوبہ روزگار نظر آئی کہ اس کے بے انتہا سر ہیں، اور دھڑ ایک جس بات کی پسند یا ناپسند پر سر ہلاتی ہے۔ تمام جہان کے سر اسی طرح ہل جاتے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ پسند عام اسی کا نام ہے ان میں سے ایک غلط نمائی کرتی ہے۔ اور دوسری دلربائی کر کے جس شے پر چاہتی ہے سب کو شیفتہ و فریفتہ کر لیتی ہے۔ یہ دونوں رات دن جادوگری میں مصروف ہیں اور تسخیر خلائق کے عمل میں شہرۂ آفاق ہو گئی ہیں۔

لوگوں کا یہ حال دیکھا کہ چاروں طرف سے انبوہ در انبوہ اُمڈے چلے آتے ہیں۔ اور اگرچہ آمد کے رستے بھی دو ہیں۔ مگر ہر رستہ انہی دونوں کی طرف جاتا ہے۔ آنے والوں میں بعض آدمی جو خود آرائی کے رنگ سے

رُخ چمکائے ہوئے اور زیبائی کے روغن سے سر چکنائے ہوئے تھے انہیں کچھ ہدایت یا اشارات کی حاجت نہ تھی خود بخود غلط فہمی کی طرف چلے جاتے تھے اور وہ عالم فریب ایک ایک شخص کو اس کی طبیعت کے موافق اس طرح لبھاتی تھی کہ لٹّو ہو جاتا تھا۔ بعد ازاں کچھ ایسی کل مروڑتی تھی کہ خود پسند عام کے پھندے میں جا کر گلا رکھ دیتا تھا۔

غرضکہ اسی طرح پھرتے پھرتے ہم ایک میدانِ جانفزا میں جا نکلے وہاں دیکھیں۔ تو پسند عام یہ چہل قدمی کر رہی ہے۔ اور بہت سے لوگ ہم سے بھی پہلے وہاں پہنچے ہوئے تھے۔ اُنہیں پھسلا رہی ہے۔ آواز اس کی ایسی رسیلی تھی کہ دل مست ہوئے جاتے تھے۔ جب بات کرتی تھی تو منھ سے پھول جھڑتے تھے۔ بولتی تھی تو سانس کے ساتھ خوشبو کی لپٹیں آتی تھیں۔ لطف یہ تھا جس شخص سے بات کرتی تھی جدا ازبان اور جُدا طرزِ بیان تھا اور جو سنتا تھا یہی خیال کر رہا تھا کہ وہ جوہرِ بے مثل جو خاص میری ذات باکمال میں قابلِ قدر ہے اسی کی بابت یہ گفتگو ہو رہی ہے پس گویا اس جنتِ بے زوال کا فرمان ملا جس کے انعام کا استحقاق کُلی مجھ میں موجود ہے۔

غرض اسی حال میں ہم سب پچھے کھچے اُس کے پیچھے چلے جاتے تھے اور مسافتِ راہ میں یا تو اپنی خوبیوں کی خود آپس میں تعریف کرتے جاتے تھے۔ یا اپنی خیالی خوبیوں پر آپ ہی اِتراتے تھے یا جنھیں اپنی وضع کا نہ پاتے اُن کی ہجو کرتے جاتے تھے۔ کچھ اپنے اپنے مدارجِ کمال پر آپس میں لڑتے جھگڑتے چلے جاتے تھے۔

غرض اسی عالم میں چلتے چلتے ایک باغ نظر آیا۔ جو کہ اسم بامسمےٰ اندھیریا باغ تھا۔ اس کے دروازے پر دیکھیں تو غلط فہمی بیٹھی ہے مگر جس مکان میں وہ بیٹھی تھی اُسے عمداً ایسی حکمت سے بنایا تھا کہ صورت اس کی دھندلی سی نظر آتی تھی۔ اس نے کچھ سفید سا لباس پہن رکھا تھا کہ جس سے دیکھنے والوں کو ملکہ صداقت کا دھوکہ ہوتا تھا اور چونکہ شہزادی صداقت پری ایک مشعل بھی ساتھ رکھا کرتی ہے جس سے اپنے عاشقوں کو حُسن خدا آفرین کی خوبیوں کا جلوہ دکھاتی ہے۔ اس نے اس کے جواب میں داہنے ہاتھ پر شیشۂ جادو۔ اور بائیں ہاتھ پر سحر سامری کی چھڑی رکھی تھی انہی ٹونے ٹوٹکوں سے لوگوں کو لبھاتی تھی اور دھوکے دغا سے سب کو پرجاتی تھی۔ چنانچہ کبھی کبھی بڑی تمکنت سے ہاتھ بڑھا کر اس چھڑی کو

اُٹھاتی اور منھ ہی منھ میں کچھ پڑھتی تھی اس کے علاوہ نرگس جادو بہت ناز و انداز کے پھول اور نمود و نمائش کی کلیاں گود میں بھرے کھڑی تھی۔ انہیں اہل اشتیاق کے سامنے بکھیر جاتی تھی۔

دفعتاً عصا کا اشارہ آسمان کی طرف ہوا اور ساتھ ہی اس کے سب کی نگاہیں اوپر اُٹھ گئیں۔ ایک نیلا قطعہ آسمان کا ایسا صاف و مصفا دکھائی دیا جیسے صبح بہار میں فلکِ فیروزی کا رنگ نکھرا ہوا ہوا سی فضائے دلکشا میں ملکہ خام خیالی کا محل نظر آیا کہ آسمان سے باتیں کرتا۔ مگر نہ معلوم ہوتا تھا کہ کونسی بنیاد ہے جس پر یہ قایم ہے۔ فقط پیچ در پیچ بادلوں کا ایک زنجیرہ تھا کہ جادو کے زور سے ادھر کھڑا تھا۔ اس کی چڑھائی کا راستہ جو ہمارے زیرِ قدم تھا۔ قوس قزح کی طرح خوش رنگ و خوشنما۔ نسیم جان بخش جو اِدھر اُدھر سبزہ پر لوٹتی تھی۔ ہر جھونکے میں عقل و حواس پر جادو کی پڑیاں مارتی تھی۔ تمام دیواریں طلسمات کے رنگ سے دم میں سُنہری تھیں۔ اور دم میں روپہلی سب سے نیچے کے دوہرے کے ستون اگرچہ باغِ ارم والی تراش پر آتارے تھے۔ مگر برف کے تراشے تھے چھت کا گنبد نہایت عالی شان تھا۔ لیکن بُرج کی جگہ ایک شیشے

کا بُلبُلہ دھرا تھا۔ اور اُس کے کلس پر طائر خیال کا ہُما پر پھیلائے تھر تھرا رہا تھا۔
مسافروں نے وہاں پہنچکر نہ کوئی دربان پایا۔ نہ کسی کا انتظار کیا۔
جو آیا اپنے جوہر قابلیت کو پروانہ اجازت سمجھے ہوئے بیدھڑک اندر
داخل ہو گیا۔ دربار کے کمرے میں پہنچے تو دیکھتے ہیں کہ بہت سی نمود
بے بود صورتیں ہیں کہ ہم ہی میں مِلی جُلی اہتمام کرتی پھرتی ہیں اور اس انبوہ
بے تمیزی میں اپنے اپنے خیالات کے بموجب ایک ایک کے درجے
قائم کر کے صفیں ترتیب دیتی پھرتی ہیں۔ مدارج عزت بھی وہاں روشن
ہوتے ہیں مگر ساعت بہ ساعت دھوپ کی طرح ڈھلتے جاتے ہیں اور لوگ
تنکے کہ بتاسے کی طرح بیٹھے جاتے تھے استحقاق پوچھو تو دادا پردادا کے
وقت کا ایک پھٹا پُرانا ساچغہ تھا۔ اس کے سوا کچھ نہیں۔
ایک طرف لاف گزاف تھی جس نے خود اپنی ذات خوش صفات
کا ایک قصیدہ بنا رکھا تھا۔ آپ ہی اس اعمالنامہ کو پڑھتی تھی اور خوش
ہوتی تھی۔ اسے اپنے سوا دوسرا ذکر نہ تھا۔ اکڑ تکڑ تھی کہ نخوں کے بل
چلتی تھی اور اینٹھتی پھرتی تھی۔ خود پرستی ایک طرف آئینہ کے سامنے کھڑی
تھی۔ آپ ہی اپنے تئیں دیکھتی تھی اور پھولی نہ سماتی تھی۔ کمرے کے

صدر میں تخت شاہانہ اور آگے ایک شامیانہ اِس شان وشوکت سے سجا ہوا تھا کہ جسقدر سجاوٹ کے گمان میں گنجائش اور حوصلہ آرائش میں وسعت تھی سب اس میں خرچ ہو گئی۔ تخت پر ہالۂ ماہ کا چتر اس کے نیچے ملکہ خام خیالی[۱] مہتاب آتشبازی کے دو پر لگائے پری بنی بیٹھی تھی جو اس کے خیال پرست تھے وہ اسے پری حُسن آفریں کہتے تھے اور زہرہ ثانی اعتقاد کرتے تھے۔ ایک نوجوان تخت کے پہلو میں کھڑا تھا۔ اور ہر ایک کو سامنے لاکر سجدے کرواتا تھا۔ معلوم ہوا کہ وہ اس کا رشید بیٹا ہے اور شہزادہ خود پرست اُس کا نام ہے۔ اس کی خودپسندی اور خود بینی کا یہ عالم تھا کہ اپنی نظر اپنے ہی پیچ میں غرق ہوئی جاتی تھی۔ اِدھر اُدھر کی شے اسے اصلاً نظر نہ آتی تھی۔ اس پر بھی لوگوں کا یہ حال تھا کہ ملکہ سے زیادہ اس کی طرف جھکتے تھے۔

ایک گلاب پاش اس کے ہاتھ میں تھا۔ بقدر حیثیت ہر شخص کے سر پر چھڑک دیتا تھا کہ خودپسندی اور بلند نظری کے خمار سے دماغ اُن کے آسمان پر پہنچ جاتے تھے۔ تماشہ یہ تھا کہ شہزادہ جو جو ہتھیار فتوحات کے لئے کام میں لاتا تھا وہ انہیں لوگوں سے لئے تھے جن کو شکار کرتا تھا۔

[۱] بات تو سچ ہے۔ خام خیالی سے ہی خود پرستی پیدا ہوتی ہے۔

چنانچہ جس بہادر کو اپنے تیر کا نشانہ کرتا تھا۔ اسی کے سر کی کلغی نوچ کر اپنے تیر کی پر گیری لگاتا تھا۔ جس نیزے سے اہل علم پر وار کرتا تھا۔ وہ انھیں کے لکھنے کا قلم تھا۔ جس تلوار سے دولتمندوں کو دو پارہ کرتا تھا۔ اس کے قبضہ پر انہیں کے خزانوں سے لے کر سونا چڑھاتا تھا۔ ناظمانِ ملک کے لئے دامِ تزویر بناتا تھا کہ پھندے اس کے انہیں کی بندش تدبیر سے اٹے ہوئے تھے۔ صاحب جمالوں کے رُخساروں سے گرمیِ حُسن لیتا تھا۔ اور عاشقوں کے ساتھ اسی میں انہیں بھی گرماتا تھا۔ یہاں تک کہ حُسن کے پھول خود بخود کُملا کر رہ جاتے تھے۔ فصیحوں کی زبانوں سے بجلی کی تڑپ نکالتا تھا کہ اپنی آگ میں آپ ہی جل کر خاک ہو جاتے تھے۔

تخت کے نیچے تین چڑیلیں پریوں کا بھیس بھرے حاضر تھیں۔ اوّل تو خوشامد تھی کہ بڑی خوش ادائی سے رنگ آمیزی کا خود سنبھالے کھڑی تھی۔ دوسری ظاہرداری آئینہ سامنے رکھے اپنے فن کی مشق کر رہی تھی بعد اس کے خوش رواجی تھی جسے اب تک ہم بھیڑ چال کہتے تھے مگر اسے دربار سے رعنائی اور خوش نمائی کا خطاب ملا تھا اس کا یہ عالم تھا کہ ہر نگاہ میں گرگٹ کی طرح نیا رنگ بدلتی تھی اور ہزاروں شکاروں کو ایک جال

میں گھستی تھی۔

غرض کہ شہزادہ خود پرست شمشیر کے زور اور تدبیر کی لاگ سے برابر فتوحات حاصل کئے جاتا تھا۔ اور یہ تینوں دولت خواہ اسکے استحکام اور محافظت میں برابر مصروف تھے۔ ہر کام کا مہتمم اپنا حق صدق دل سے ادا کر رہا تھا۔ چنانچہ خوشامد جس شے پر ضرورت دیکھتی تھی نئے سے نیا رنگ چڑھا دیتی تھی کہ ہر دل کی آنکھ کو خوش آتا تھا۔ ظاہر داری ایسے ایسے ڈھنگ سے نمائش دیتی تھی کہ کیسی ہی بدنما شے ہو، خوش نما ہو جاتی تھی۔ خوش رواجی کا یہ عالم تھا کہ موٹے سے موٹے عیب ہوتے انہیں ڈھانک دیتی۔ بلکہ اُن پر ایسی خوبیاں چپکاتی کہ جنہیں اس سے کچھ لگاؤ بھی نہ ہوتا۔

میں ان حالات کو نگارہ غور سے دیکھ رہا تھا جو ایک آواز دردناک کان میں آئی۔ گویا کوئی کہتا ہے۔ ہائے آدم زاد ہائے تیری غفلت خود رائی سے ہدایت پاتا ہے غلط فہمی کے دم میں آجاتا ہے۔ خود پسندی کی اشتعالک سے چمک اٹھتا ہے۔ خام خیالی کے قدموں پر چل کر تعلیم پاتا ہے۔ یہاں تک کہ مفلسی اور خواری کی زنجیروں میں گرفتار ہو جاتا ہے۔"

یہ کلمے ابھی زبان بہ زبان پھیلنے نہ پائے تھے جو دفعتہ ایسی ہلچل

پڑی کہ تمام انبوہ تہ و بالا ہوگیا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد ایک طرف سے رستہ کھلتا معلوم ہوا۔ دیکھوں تو ایک بڈھا نورانی صورت معقول وضع ہے جس کے چہرے پر سنجیدگی اور متانت برستی تھی اسے گرفتار کئے لاتے ہیں۔ اور جو کلام عبرت انگیز نصیحۃً اس نے زبان سے نکالا تھا اسکی سزا دینے کو لئے جاتے ہیں کیونکہ وہ ان کے آئینِ حکومت میں سراسر باعثِ خرابی تھا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ اس نے جو کچھ کہا تھا فقط بری الذمہ ہونے کو کہا تھا۔ اس کا نام ناصح دانش تھا۔

مگر لوگ ایسے بپھرے ہوئے تھے کہ اس بیچارے کی بات سننی بھی گوارا نہ تھی بلکہ اُسے ایسی خواری اور زاری میں دیکھ کر خام خیالی بھی مسکراتی تھی۔ خود پسندی تیوری چڑھاتی تھی۔ خوشامد ذرا اسے راستباز سمجھتی تھی۔ اُس نے اتنا لحاظ کیا کہ برقع اوڑھ کر برابر سے نکل گئی۔ ظاہرداری نے اپنا پنکھا اٹھا کر اس کی اوٹ میں منہ چڑا دیا۔ کسی نے اس بیچارے کا نام حاسد رکھا۔ کسی نے عیب جو کا خطاب دیا۔ رواج نے دھوم مچادی کہ بد اطوار سلطنت کے برخلاف بغاوت پھیلانی چاہتا ہے۔ غرض اس پیر دیرینہ سال نے ہر طرف سے ذلت ہی ذلت اٹھائی اور اس جرم میں کہ

ایسے ایسے لائق وفائق مغروروں کے حق میں گستاخی کی چاروں طرف سے دھکے کھائے بلکہ تحقیق خبر لگی کہ اگرچہ اس وقت نکالا گیا ہے۔ مگر حکم ہے کہ آئندہ اگر کہیں صورت دکھائی تو اس کے حق میں بہت بُرا ہوگا۔

بڈھے بیچارے نے جو کچھ کہا اس میں سے بہت کچھ تو میں آنکھوں سے دیکھ چکا تھا۔ باقی باتوں کے لئے سوچ رہا تھا کہ دیکھئے کس رنگ سے پوری ہوں۔ اتنے میں باہر کی طرف سے ایک غل تھا اور ظلم وستم اور بے انصافیاں چڑیوں کے برن میں اس طرح اڑنے لگیں۔ گویا آندھی آئی۔ انہوں نے اس کثرت سے ہجوم کیا کہ دروازہ تیرہ وتار ہو گیا۔ بیوقوفی اور بے اعتباری نمودار ہوئی۔ تکلیف شرم۔ رسوائی۔ حقارت مفلسی سب آگے پیچھے حاضر ہوئیں۔ اُن کے آتے ہی اِدھر تو خام خیالی جو سونے کی چڑیا بنی بیٹھی تھی۔ ادھر شہزادہ خود پرست ان کے ساتھ ساری پریاں دم کے دم میں ہوا ہو گئیں۔ ادھر تمام معتقد اور ہوا خواہ ان کے بھاگ بھاگ کر کونے گوشے اور سوراخوں میں گھس گئے۔ مگر ایک شخص میرے پاس کھڑا تھا اسے کہیں سے دُوربین ہاتھ آگئی۔ چنانچہ اس نے دیکھا اور دفعتہً بولا کہ وہ گرفتاری کا حکم ہوا۔ وہ سو آدمیوں کا غول جیل خانہ کو چلا دو ہزار

آدمی تہ خانہ میں قید ہونے کو چلے۔ وہ سب اندھیری کوٹھڑیوں میں بند ہو گئے۔ مُراد اس قید سے زندگی کے عذاب، دنیا کے دھندے، مکرو فریب کے جھگڑے تھے۔ جن مکانوں میں وہ لوگ ڈالے گئے اُن کی خرابی دیکھنی چاہو تو دلہائے پریشاں کی بد حالی کو دیکھ لو۔ وہ لوگ اگرچہ یہاں ہائے وائے بہت سی کرتے تھے، مگر نکلنے کے رستے کی طرف کبھی خیال نہ کرتے تھے۔ چنانچہ اس شخص نے ناک چڑھا کر کہا کہ یہ کمبخت اپنی حماقت اور شامت اعمال سے آپ یہاں پڑے ہیں نہیں تو نہ یہ مکان اُن کی شان کے قابل ہیں۔ نہ یہ اخراجات ان کے سامان کے لئے کافی ہیں۔ خیر ہم نے ایسے تماشے بہت دیکھے ہیں۔ اب یہ ہلچل ہو چکے گی تو پھر وہی بہار کا سماں ہو گا۔

جب میں نے یہ سنا تو اُس کارخانہ کی ناپائیداری نے میرا دل بیزار کر دیا۔ میرے رفیق نے جو خبر دی تھی میں نے اس کا شکریہ ادا کیا مگر جب دیکھا کہ بغیر گرفتار ہوئے یہاں سے نہ سرکے گا تو میں چپکے سے دروازے کی طرف کھسکا۔ اور چند شخصوں میں جا ملا کہ جو صداقت اور واقعیت کو ملتے تو نہ تھے۔ مگر اُن کی شامتِ اعمال کے گرفتاروں کو دیکھ کر ڈر گئے۔

تھے جب ہم دروازے کی دہلیز پر پہنچے تو دل پر صدمۂ عظیم گزرا۔ یعنی وہاں آکر غلط نمائی کا پردہ آنکھوں سے اُٹھ گیا۔ تب معلوم ہوا کہ اس محل کی بنیاد بالکل نہیں مُعلق ہوا میں کھڑا ہے اوّل تو ہم نے سوائے اس کے چارہ نہ دیکھا کہ موت کا کنواں ہے۔ آنکھیں بند کر وا اور کُود پڑو۔ پھر اس پہلی ہوس بے حاصل پر دل کو ہزار لعنت ملامت کی جس نے اس عذاب میں گرفتار کیا۔

اب مقام تعجب یہ ہے کہ جس قدر یہ سب اپنے اپنے دل میں غور کرتے جاتے تھے اتنا ہی وہ محل ہمیں نیچے اُتارتا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ جو حالت ہم اپنے مناسب حال دیکھتے تھے اسی انداز پر آکر ٹھیر گیا۔ رفتہ رفتہ تھوڑی دیر میں جہاں ہم کھڑے تھے وہ مقام زمین سے لگ گیا۔ ہم سب نے نکل کر اپنا اپنا رستہ لیا۔ اور محل آنکھوں سے غائب ہو گیا۔ اب یہ نہیں کہہ سکتے کہ جو لوگ اس میں رہے ان پر کیا گزری اور انہیں ہمارے اُتر جانے کی خبر بھی ہوئی یا نہیں۔ میں تو جانتا ہوں کہ نہیں ہوئی۔ خیر جو ہو سو ہو اس سوچ میں دفعتہً میری آنکھ کھل گئی۔ خواب تو خواب و خیال ہو گیا مگر نصیحت ہوئی کہ اب خام خیالی کے اشاروں پر کبھی نہ چلوں گا۔ اس راہ خطرناک میں پھر قدم نہ دھروں گا۔

خوش طبعی

خوش طبعی کی تعریف میں یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ وہ کیا شے ہے البتہ یہ کہنا آسان ہے کہ وہ کیا شے نہیں ہے۔ میں اگر اس کی نسبت کچھ خیالات بیان کروں تو افلاطون حکیم الٰہی کی طرح کنایہ اور استعارہ سے بیان کروں اور ظرافت کو ایک شخص قرار دے کر اُس سے وہ صفتیں منسوب کروں جو کہ نسب نامہ مندرجہ ذیل میں درج ہیں۔ یہ واضح ہو کہ سچ خوش طبعی کے خاندان کا بانی مبانی ہے۔ اس گھرانے میں حُسنِ ادب ایک نہایت معقول شخص تھا۔ اُس کا بیٹا حُسنِ بیان ہوا۔ اُس نے ایک اپنے برابر کے خاندان میں شادی کی۔ اس کی دلہن کا نام خندہ جبیں تھا کہ آٹھ پہر ہنستی ہی ہنستی تھی۔ چنانچہ ان کے گھر میں میاں خوش طبع پیدا ہوئے۔ چونکہ خوش طبع پیدا ہوئے۔ چونکہ خوش طبع سارے خاندان کا لُبِّ لُباب تھا۔ اور بالکل مختلف طبیعت کے والدین سے پیدا ہوا تھا۔ اس لئے اس کی طبیعت بوقلموں اور گوناگوں تھی۔ کبھی تو نہایت سنجیدہ اور معقول وضع اختیار کر لیتا تھا اور کبھی رنگین بانکا بن جاتا تھا کبھی ایسا بن کر نکلتا۔ گویا

قاضی الحاجات یا شیخ الاسلام چلے آتے ہیں اور کبھی ایسے مسخرے بنجاتے
کہ بھانڈوں کو بھی طاق پر بٹھاتے لیکن چونکہ ماں کے دودھ کا بڑا اثر
ہوتا ہے اس لئے کسی حالت میں ہو، اہلِ محفل کو ہنسائے بغیر نہ رہتا تھا
اسی کے ہمسایہ میں ایک مکر باز، جعل ساز بھی رہتا تھا۔ کہ اس نے بھی
خوش طبع اپنا نام رکھ لیا تھا۔ اور لوگ بھی اس بدذات کو اسی کا قائم
مقام سمجھتے تھے۔ پس اس خیال سے کہ نیک مرد ناواقف اسکے دھوکے
میں نہ آئیں۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کتاب کے پڑھنے والے اگر کبھی ایسے
شخص سے ملیں تو اس کی اصل نسل کو اچھی طرح سمجھ لیں اور غور سے
دیکھیں کہ دور و نزدیک کچھ رشتہ اس کا بنچ کے قبیلہ سے جا ملتا ہے یا نہیں
اور حقیقت میں وہ حسنِ ادب کے گھرانے سے پیدا ہوا ہے یا کسی اور
سے۔ اگر یہ نہ ہو تو وہی جعل ساز بہروپیہ سمجھیں۔
ایک پہچان اس کی یہ بھی ہے کہ جب وہ کسی محفل میں بیٹھا ہوتا ہے
تو اسی کے قہقہے کان میں آتے ہیں اور گرد اس کے متین اور معقول
لوگ خاموش بیٹھے نظر آتے ہیں۔ اور جب ظرافت اصلی محفل آرا ہوتی
ہے تو آپ کمال سنجیدگی سے بیٹھی رہتی ہے۔ گرد اس کے سب ہنستے ہیں

بلکہ اتنی بات اور بھی کہتا ہوں کہ اگر اس کے خاندان میں خوش طبعی یا خندہ جبینی یا خوش بیانی کسی کی بو نہ آئے تو اسے بھی وہی جعل ساز بہروپیہ سمجھنا چاہیئے۔

جس بہروپیہ بھانڈ کا میں نے ذکر کیا وہ اصل میں جھوٹ کی اولاد سے ہے۔ اور جھوٹ حقیقت میں زٹل کا باپ تھا۔ زٹل سے ایک بیٹا پیدا ہوا۔ کہ اس کا نام سڑی مستان تھا۔ اسی طرح حماقت ایک پھوڑ عورت تھی۔ اور اس کی ایک بیٹی تھی جسے مسخرن دیوانی کہتے تھے۔ اس سے سڑی مستان نے شادی کی۔ ان دونوں سے عجب طرفہ معجون بچہ پیدا ہوا جسے تم بہروپیہ بھانڈ سمجھتے ہو۔ بعض اشخاص کو بعض اوقات اسکے کلام میں بھی خوش طبعی یا خوش بیانی کی بو آتی ہے۔ مگر وہ حقیقت میں ظرافت بد اصل ہے۔ اب میں ان دونوں کا نسب نامہ لکھتا ہوں:۔

جھوٹ

زٹل

سڑی مستان — مسخرن دیوانی

ظرافت بد اصل یا نقلی

یعنی بہروپیہ بھانڈ

سچ

حسن ادب

حُسن البیان

خوش طبعی خاوند — خندہ جبینی بی بی

ظرافت اصلی یا خوش طبعی

ہیں اِس استعارہ کو زیادہ تفصیل دینا۔ اور ظرافت بداصل یعنی بھروپیئے بھانڈ کی اولاد جو ریگ بیاباں سے بھی زیادہ ہے بیسب کا حال نام بنام بیان کرنا خصوصًا ان لڑکے لڑکیوں کا کچھ حال لکھنا جن سے ملکِ وجود میں اس نے اپنی ناپاک نسل پھیلائی ہے مگر اس سے جابجا حسد کی آگ بھڑک اُٹھتی اس لئے جی نہیں چاہتا۔ پھر بھی اتنا ضرور کہوں گا کہ ظرافت اصلی اور ظرافتِ نقلی میں اتنا ہی فرق ہے جتنا آدمی اور بندر میں بیسب سے پہلے تو یہ ہے کہ اسے بندر کی طرح جھوٹ موٹ کی دغابازیاں اور ویسے ہی نقلیں کرنے کی عادت ہے۔ دوسرے اس قسم کے کام کرکے نہایت خوش ہوتا ہے بلکہ دونوں باتیں اسے یکساں ہیں خواہ خلعت پہنادے خواہ رسوا کرادے۔ ابھی ایک شخص کو باعظمت و احترام بنادے۔ ابھی چٹکیوں میں اُڑادے۔ کسی کی نافہمی و بدعقلی دکھادے۔ کسی کی دانش و دانائی سنادے، ابھی دولت و نعمت کی مسند پر بٹھادے، ابھی کنگال فقیر بنادے۔ سبب اس کا یہ ہے کہ جھوٹ کی تھیلی ہر وقت بھری ہے کبھی خالی نہیں ہوتی۔ تیسرے ایسا کم بخت ہے کہ جو ہاتھ اسے رزق دیتا ہے اسی کو کاٹ کھاتا ہے اور دوست دشمن دونوں کی برابر خاک اُڑاتا ہے

سبب اس کا یہ ہے کہ انسانیت سے خارج ہے۔ اس لئے خوش طبعی کئے جاتا ہے۔ جیسی ہو سکے اور جہاں ہو سکے۔ نہ یہ کہ جیسی ہونی چاہیئے اور جہاں ہونی چاہیئے۔ چوتھے چونکہ عقل سے بالکل محروم ہے۔ اس واسطے اخلاق یا صلاحیت کی نصیحت پر ذرا کان نہیں دھرتا۔ پانچویں چونکہ ہنسی ٹھٹھول کے سوا اور کسی قابل نہیں۔ اور ہر شخص پر فوقیت کی ہوس رکھتا ہے۔ اس کا تمسخر ہمیشہ ذاتی ہوتا ہے یعنی کسی صاحب معاملہ، یا صاحب تصنیف کی ذات سے منسوب ہوتا ہے۔ نہ کہ فقط اسکی بُرائی یا تصنیف سے۔

نکتہ چین

نکتہ چین ناانصاف کی بدولت تصنیف کا کیا حال ہوتا ہے

مصنّف اپنی تصنیف میں یا تو نئے نئے مطالب اور تازہ مضامین سے دلوں کو شگفتہ کرتا ہے یا مطالب معلوم کو بنا سنوار کر نئی آرائش و زیبائش سے سامنے لاتا ہے کبھی نئی روشنی کا جلوہ دے کر دیدۂ نظرباز کو عجائب و غرائب تماشے دکھاتا ہے۔ کبھی دیکھی بھالی چیزوں کو نئے رنگ دے کر اور موقع مقام بدل کر انہی میں تازگی اور دلربائی کے انداز پیدا کرتا ہے۔ بلکہ ایسے رنگ برنگ کے گل پھولوں سے سجاتا ہے کہ ہر چند ایک دفعہ طبیعت ان کی گلگشت کر چکی ہو مگر خواہ مخواہ پھر دیکھنے کو جی چاہتا ہے۔ اور جن چمنوں پر عقل سبک سیر جلدی گزر گئی ہو یا سرسری نظر کر گئی ہو۔ اس کا دوبارہ دل میں اشتیاق پیدا ہو جاتا ہے۔

درحقیقت ان محنتوں میں سے جس محنت کو دیکھو مشکل سے مشکل ہے کیونکہ تصنیف مذکور کے مفید اور کارآمد ہونے کے لئے اتنی ہی بات

کافی نہیں ہے کہ لوگوں کو اُن کی غلط فہمی یا عیب وصواب سے آگاہ
کردے۔ بلکہ ایک انداز برتنا چاہیئے۔ جس سے ان کے دلوں میں اپنے
رہنما یعنی مصنّف کا اُنس اور اس کے کلام کا اشتیاق پیدا ہو۔ اور
اس کے سبب سے وہ فقط اپنی ناواقفیت کا اقرار ہی نہ کریں بلکہ ایک
اس سے بھی کڑوا گھونٹ ہے اسے گوارا کریں یعنی یہ بھی سمجھیں کہ یہ
دل آگاہ خیر خواہ ہم سے زیادہ تر دانا ہے۔
جو شخص مراتب مذکورۂ بالا پر نظر کرے گا وہ خود سمجھ لے گا کہ ہر ایک
بات ان میں سے پرلے سرے کی خطرناک اور نہایت جانکاہی کا کام
ہے۔ پھر ایسا بیدرد کینہ ور کون ہوگا کہ فارون بیچارہ جو خود عذاب خدا
کا مارا ہے اس کے بوجھ میں پتھر بھر دے اور اسے ایک دل لگی سمجھے۔
کیسی بیدرد کوششیں ہوں گی جو ایسے آرزومند کا دل توڑنا
گوارا کریں کہ نہ اُن سے کسی شے کا طالب ہے نہ ان کے کام میں کچھ حارج
ہے۔ فقط اتنی بات ہے کہ اپنی یا اپنے کلام کی شہرت چاہتا ہے اسی کے
لئے یہ مصیبتیں ہیں کہ وقتِ عزیز کو صرف کرتا ہے۔ آرام کو تکلیف سے
بدلتا ہے۔ چراغوں کے دھوئیں کھانا دماغ کا عرق پیشانی سے

ٹپکاتا ہے اور ان سب منزلوں کا پہلا قدم یہ ہے کہ اکثر تو کامیابی کی جگہ ناکامی اُٹھاتا ہے اور کامیاب ہو تو فائدہ قلیل۔ یہ بیچارہ ان مصیبتوں پر بھی صبر کرتا ہے۔ اور اپنے شوق کو پورا کرتا ہے۔

ہاں ایک نسل کے آدمی ایسے بھی ہیں کہ یا تو ایسی خلل اندازیوں کو فرض الٰہی سمجھے ہوئے ہیں یا اپنے دل کا بہلاوا سمجھتے ہیں۔ جو ہمیشہ اسی تاک میں رہتے ہیں کہ ایسا نہ ہو کسی صاحب کمال کا جوہر قابل لوگوں کی نظر پڑ جائے۔ ہاں ہاں یہ وہی لوگ ہیں کہ قلعہ شہرت کے دروازے پر عصائے منصب داری لئے کھڑے ہیں اور فخر اپنا اس بات میں سمجھتے ہیں کہ جہالت اور عداوت جو چنگیز و ہلاکو کے تیر و تلوار لئے بیٹھے ہیں۔ یہ ان کے دربار میں سب سے پہلے عرض پہنچائیں کہ حضور کا شکار حاضر ہے۔

جو لوگ تصنیف کا ارادہ کریں انہیں ابتدا میں اتنا ضرور چاہیئے کہ جو اشخاص نکتہ چینی کے خطاب و القاب سے شہرۂ آفاق بننا چاہتے ہیں ان کی خدمت میں ایک سفارش کا بندوبست کریں۔ کیونکہ ان مردم آزاروں میں بڑے سے بڑا بے درد تھوڑا بہت نرم ہو سکتا ہے یا کچھ

عرصہ کے لئے طبیعت کی نیش زنی کو چھوڑنا بھی گوارہ کر سکتا ہے۔ میں نے اس تدبیر کی تلاش میں طبعِ سلیم کی طرف رجوع کی اور عہد قدیم کے بہت پرانے پرانے دفتر اُلٹے۔ آخر دیکھتے دیکھتے یہ معلوم ہوا کہ کالا ناگ آگ سے پرچ جاتا ہے اور بھونکتا کتا بھی ہڈی سے چپ جاتا ہے۔ آج کل کے نکتہ چیں اگرچہ سانپ جتنے دانت بھی نہیں رکھتے مگر اُس سے بھی سوا زہر اُگلتے ہیں۔ اور کتے کے برابر بھی نہیں کاٹ سکتے۔ مگر بھونکنے میں اُس سے بھی کئی میدان پرے نکل جاتے ہیں۔

پس یقین ہے کہ اس قسم کے طریقوں سے وہ بھی بند ہو جائیں گے چند اشخاص کے باب میں یہ تو سنا کہ بعض تو ایک گلاس شراب اور ایک سیخ کباب پر راضی ہو گئے اور بعض اُن میں سے خوشامد کے راگوں کی چار تانیں سُن کر قابو میں آ گئے۔

لیکن شوق ہمت نے بڑے ڈھب کام پر کمر باندھی ہے۔ اگرچہ عقل نصفت اندیش اُسے دلائل یقینی سے قائل کرتی ہے اور سمجھاتی ہے کہ اس بد اندیش نسل کے حملہ ہائے متواتر سے ڈرنا چاہیے۔ مگر وہ اپنی جگہ پر ڈٹا ہوا ہے ......

کہ جس مخالفت کا اُنہوں نے دعویٰ باندھا ہے وہ انھیں قانونِ مصلحت کی رو سے جائز نہیں، بلکہ یہ اُن کی جعلی حکومت جس کی نہ سند ہے نہ شہادت اور اسی دعوے پر اُنہوں نے اُستاد نکتہ چیں کے خطاب سے حاکم دار العدالت کی طرح فیصلے کئے ہیں۔ حق پوچھو تو مجھے یہ بھی صاف دھوکہ نظر آتا ہے

داستان

حقیقتِ حال یہ ہے کہ نکتہ چینی جس کی بدولت ان لوگوں نے مصنفوں کی قسمت کے فیصلہ کرنے کا اختیار پایا ہے۔ اصل میں خواجہ حق پرست اور محنت خانوں کی سب سے بڑی بیٹی تھی۔ جب وہ پیدا ہوئی تو پرورش کے لئے انصاف کے سپرد ہوئی۔ چنانچہ اُس نے دانش کے محلوں میں پال کر تربیت کیا۔ وہاں دن رات علوم کی جواہر کاری اور فنون کی مرصع کاری کو دیکھا کرتی تھی۔ اور صبح و شام عقل آرائی کے باغوں

میں جی بہلایا کرتی۔ جب بڑی ہوئی تو عالمِ بالا کے بزرگوں نے اُسے حسنِ کمال اور کمالِ حسن میں بے مثال دیکھ کر ملکِ خیال کا تاج سر پر رکھ دیا کہ چند روز کے بعد مملکتِ خیال کی ملکہ ہو کر عالمِ بالا کی پریوں میں داخل ہو گئی۔ وہاں کی پریاں موسیقی۔ ناچ رنگ رسانگ۔ شاعری افسانہ۔ تاریخ۔ وغیرہ اپنے اپنے فن کی مالک تھیں۔ چونکہ اُنہیں بھی ملکِ خیال سے تعلق تھا اس لئے ملکہ نکتہ چینی نے اُن کے کلام میں بھی دخل پیدا کر لیا۔ جب اُنہوں نے عالمِ خاک کی طرف نزول کیا تو ملکہ نکتہ چینی کی کہ خود فرمانروائے ملکِ خیال تھی۔ وہ بھی اُن کے ساتھ روئے زمین پر آئی۔ محل سے چلتے وقت انصاف یعنی اس کے اُستاد نے ایک پھولوں کی چھڑی دیدی تھی کہ اُسے تمغائے شاہی کی طرح ہر وقت اپنے داہنے ہاتھ میں رکھا کرے۔ عالمِ بالا کے دربار میں دستور تھا کہ جس رات کوئی پری اکھاڑا جیتا کرتی تھی تو اس مبارکباد میں اُسے ایک ہار ملا کرتا تھا جس میں گلہائے جنت کی کلیاں اور امرت کے درخت کی کونپلیں پروئی ہوتیں۔ چنانچہ عصائے مذکور کے ایک سرے پر وہی ہار اور طرے سجا کر اُنہیں ....

آبِ حیات کے چشمہ سے شاداب کیا جاتا اور دوسرے میں سروپیشہ
کی پتیاں اور پوست کے ڈوڈے باندھ دیئے جاتے یہ دریائے
محویت کے پانی میں ڈوبی ہوئی تھی جن سے افیون کا گھولوا اور پوست
کا پانی ٹپکتا تھا۔ ملکہ موصوفہ کے بائیں ہاتھ پر ایک مشعل بھی تھی کہ اُس کی
روشنی کبھی بجھتی نہ تھی۔ اس مشعل کو خود محنت خاتون نے بنایا تھا۔ اور
حق پرست نے روشن کیا تھا۔ بڑا جوہر اس میں یہ تھا کہ چیز کیسی ہی مخفی ہو
اس کی روشنی سارا حال جوں کا توں آئینہ کر دیتی تھی۔ بلکہ ہنر کی الجھاوٹ
اور حمق کی خرابی کام کو کیسا ہی درہم برہم کر کے الجھادے مشعلِ حق
کی روشنی پڑتے ہی اس کی سدھاوٹ کا حال بال بال روشن ہو جاتا
تھا۔ ظاہر آرائی اور غلط نمائی کے پیچوں میں اس کی شعاع سوئی کی طرح
بیٹھ جاتی تھی اور جن جن ایچ پیچ میں ان کے لغویات پیچیدہ تھے اُنھیں
دفعتہً کھول دیتی تھی۔ بہت سے زرق برق کے لباس کہ فصاحت اور
عبارت آرائی نے جھوٹ کے ہاتھ بیچ ڈالے تھے۔ یہ اُن کے بھی
بخیے کھول دیتی تھی اور گھٹت بڑھت کی پتلیاں جو بناوٹ کے کپڑے
پہن کر ٹھیک ٹھاک بن بیٹھتی تھیں۔ اُنھیں بھی جھٹ پکڑ لیتی تھی۔

غرضکہ ملکہ موصوفہ ایسے ایسے شاہانہ سنگاروں سے سج کر آسمان سے نازل ہوئی۔ تاکہ جو لوگ ان صاحب کمال پریوں کے دم بھرتے ہیں اور اعتقاد کا حق زبانِ قلم سے ادا کرتے ہیں۔ اُن کی جانکاہی اور محنتوں کی قدردانی کرے۔ چنانچہ جو کچھ اس کے سامنے پیش ہوتا تھا۔ اس پر مشعل حق کی روشنی سے نظر کرتی تھی اور جب سب طرح دیکھ بھال کر خاطر جمع کر لیتی تھی اور سمجھ لیتی تھی کہ اس تحریر میں قانون درستی پر کما حقہ عمل ہوا ہے، تو عصا کا آبحیات والا سرا چھو کر اجرائے دوامی کا حکم چڑھا دیتی ہے۔ اس سے آبحیات کی شبنم برستی تھی اور تصنیف مذکور کو خاص و عام میں رواج دوام ہو جاتا تھا۔ لیکن اکثر ایسا بھی ہوتا تھا کہ جو کتابیں اس کے سامنے پیش ہوئیں۔ اُن میں دیکھا کہ بہت سے مضامین بے اصل ہیں بلکہ ذغل فصل کے مطالب خرچ ہوئے ہیں۔ البتہ محنت نے ان پر جھوٹے موٹے رنگ و روغن چڑھا کر رنگ آمیزی کی ہے۔ مگر پھر بھی الفاظ اور مطالب ٹھیک ٹھیک مطابق نہیں بیٹھے۔ یا فکر صحیح نے مطلب اصلی سے درست جوڑ نہیں دکھایا۔ یا کچھ واہیات ٹرٹلیں احمقوں کے خوش کرنے کو لکھ دی ہیں ....

یا کتاب کی ضخامت بڑھانے کے لئے بے قاعدہ مطالب درج کر دئے ہیں۔ کہ ان میں لطفِ مضامین ہے۔ نہ بات کی پختگی ہے۔ نہ کچھ زیادہ فائدہ مند ہے۔ غرض جہاں کوئی بات کھٹکتی تھی۔ اور ایسی چوک اس پر کھل تو جاتی ہی تھی، پس وہاں ملکہ نکتہ چینی اس سے کے چھوانے سے انکار کرتی تھی۔ جس سے تصنیفِ مذکور کے رواج کو استقلال دوام ہو جائے بلکہ جس میں بہت سی موٹی موٹی غلطیاں دیکھیں تو اُسے عصا کے دوسرے سے ٹھکرا کر ہٹا دیا۔ یہ پوست کے ڈودے اور سرو کے پتے ایسا زہر بہاتے تھے کہ اسی وقت سے کتاب مذکور آہستہ آہستہ محو ہونے لگتی تھی، اور جس طرح کوئی افیونی نشے کے رنگ میں اونگھتے اونگھتے تحت الثریٰ پہنچ جائے۔ اسی طرح تھوڑے ہی عرصہ میں بالکل نیست و نابود ہو جاتی تھی۔ چند روز کے بعد کسی کو خبر بھی نہ رہتی تھی کہ کیا تھی اور کیا ہو گئی۔ کئی کتابیں ایسی بھی نکلیں کہ انھیں دیکھکر ملکہ متردد ہوئی اور اپنی چھڑی کو جو حقیقت عدل کی ترازو تھی۔ بیچوں بیچ سے پکڑے کھڑی رہی اور دیر تک سوچتی رہی۔ چنانچہ رفتہ رفتہ ایسی کتابیں

اس کثرت سے جمع ہوگئیں کہ بلکہ اُن کے مشکوک دعووں اور بے جا سفارشوں پر توجہ کرتے کرتے تھک گئی۔ آخر بنظرِ احتیاط کہ مبادا انصاف کی چھڑی بیجا کام میں آئے اُن کے مقدمے کو وقت کے حوالے کردیا۔ اور وہ خود بخود اُن کے بُرے بھلے کی حقیقت کھولدے گا۔ مطلب اِس سے یہ تھا کہ تصانیفِ مذکورہ دعوؤں کے زور اور سفارشوں کی قوت سے چار دن کی چاندنی کی طرح چند روز رہیں گی۔ مگر ایک زمانہ کے بعد خود بخود سب کو معلوم ہوجائے گا کہ کتنا اندھیرا ہے کتنا اُجالا ہے وقت کے کاروبار سُست تو تھے۔ اور شروع میں کچھ باتیں واہیات بھی معلوم ہوتی تھیں۔ مگر اور سب باتوں میں اُس کی رائے بالکل انصاف سے متفق تھی۔ بعض اشخاص ایسے بھی تھے کہ ان کی تصنیفات پر جو چھڑی کے چھُوانے میں کچھ توقف ہوُا۔ تو اس سے اُنھوں نے سمجھ لیا کہ ہم بالکل کامیاب ہوگئے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ وہ اپنی کتابیں بغل میں مارے رواجِ دوام کے بھین میں خوشی خوشی زمانِ آئندہ کی طرف بھاگے جاتے تھے۔ مگر زمانہ گذرا۔ ان کی ورانتی کے نیچے اُنھیں بھی گھس کھانا پڑا۔ اور ایک زمانہ معہوت کے بعد خود بخود ذکٹ کر گو پڑے سے

یہ بھی ظاہر ہے کہ اُن میں سے بعض تصنیفات تو آہستہ آہستہ کٹ کٹ کر برباد ہو گئیں اور بعض ایک ہی ایک رگڑے میں دو ٹکڑے ہو کر فنا ہو گئیں۔

ملکہ نکتہ چینی بہت دیر تک وقت کے عملدر آمد کو دیکھتی رہی اور آخر کار اس کے کاروبار سے مطمئن ہو کر اپنے اُستاد خداوند انصاف کے ساتھ دُنیا سے چلی گئی۔ مگر یہ غضب ہوا کہ غلط فہمی اور ہٹ دھرمی کو عداوت۔ دغا اور خرابی کی رفاقت میں کھلا چھوڑ گئی کہ جس کی محنت اور جانکاہی کو چاہیں بے دھڑک برباد کیا کریں۔ بلکہ اب تو ملکہ نے اتنی ہی بات پر اکتفا کیا ہے کہ وہ دور سے بیٹھی تماشہ دیکھا کرتی ہے مگر اس میں بھی شک نہیں کہ جو دل علم کے فیض اور نیکی کے نور سے اثر پذیر ہیں اُن تک اپنا فیض پہنچاتی ہے۔

اکثر نالائقوں کی بدتمیزی کے سبب سے ملکہ چلتے وقت خفا بھی ہوئی تھی۔ اور اپنے عصا کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے اُچھال دیا۔ چنانچہ آبحیات والا ٹکڑا تو خوشامد اور چاپلوسی نے اُچک لیا تھا اور دوسرا جو آب محویت سے آلودہ ہو رہا تھا۔ وہ عداوت نے لپک لیا تھا چاپلوسی جسے آبحیات والا سرا ہاتھ آیا تھا اس کے مرید اور غلام بہت سے

موجود تھے۔ مگر اُن کے پاس نہ تو روشنی موجود نہ وہ روشنی چاہتے تھے، اسی واسطے اچھے برُے کا خیال نہ کیا۔ کبھی تو زبردست کے دباؤ سے کبھی دُنیا کی طمع سے کبھی اپنے لطف طبع کے لئے جو کچھ کوئی پیش کرتا اُسے آبحیات والا سرا چھوا دیتے۔ ادھر عداوت کی چغلخوروں سے بڑی راہ تھی۔ اُنہوں نے اُسے ایک لالٹین تیار کر دی۔ مگر اس میں خرابی یہ تھی۔ کہ روشنی اُس کی ایک رُخی تھی یعنی فقط برائیوں پر ہی پڑتی تھی۔ خوبیاں بالکل نظر نہ آتی تھیں ؎

دشمنانِ تیرہ دل کی تیرگی کو کیا لکھوں جسقدر دیکھو سوا اُتنا سوا اندھیر ہے

غرض چاپلوسی اور عداوت دونوں کے مُرید اپنے اپنے سونٹے کے زور پر راستی اپنی ملکہ کے اجرائے احکام کے لئے عالم میں پھیل گئے کہ جسے چاہیں عمر دوام بخشیں اور جسے چاہیں ایک دم میں فنا کر دیں۔ مگر اب اس ٹوٹی پھوٹی چھپڑی کی بھی طاقت بالکل جاتی رہی ہے۔ وقت اُن کے فیصلہ کا ذرا لحاظ نہیں کرتا۔ جو چاہتا ہے بے لاگ حکم چڑھا دیتا ہے۔ اور وہی تمام عالم میں جاری ہو جاتا ہے۔ آؤ میرے دوستو! اُسی کی راہ انتظار پر بیٹھ جاؤ۔

مرقع خوش بیانی

خوش بیانی کا مرقع اور فصاحت اصلی و نقلی کی جنگ

جس شغل میں مُدت تک انسان کی دل لگی رہی ہو۔ اُس سے بالکل دل کا اُٹھالینا بہت دشوار ہے۔ ہرچند دل کو اُس کی باتوں سے حرکت نہ دیں۔ مگر اس میں آپ ہی آپ خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ جیسے سمندر میں مدّو جزر آکر ٹھیر جاتا ہے۔ اور ہوا کے جھونکے بھی تھم جاتے ہیں۔ مگر پانی گھڑیوں پڑا لہرایا کرتا ہے۔ اسی طرح آج مجھے خیال ہوا۔ یعنی پچھلی رات باقی تھی جو بیٹھے بیٹھے نیند آگئی۔

اس عالمِ خواب میں خوش بیانی کا ایک مرقع مسلسل میری آنکھوں کے سامنے سے گذرا۔ نہیں کہہ سکتا کہ وہ خوش بیانی اصلی تھی یا نقلی۔ یا دونوں مرکب تھی۔ مگر ایسا معلوم ہوُا۔ گویا مجھے ایسی سرزمین میں لے گیا ہے جو دنیا کے عجائب غرائب سے مالا مال بلکہ سحرکاری اور نیرنگ سازی سے بھری ہوئی ہے۔ اس ملک میں

ایک ملکہ کی حکمرانی تھی۔ جسے وہاں کے لوگ ملکہ سخن آرا سمجھتے تھے۔ مگر دُنیا کے لوگ خوش بیانی بے معنی مشہور کرتے تھے۔ دیکھتا ہوں کہ باغ سے شہر اور شہر سے اُجاڑ تک بلکہ کھیت سے جنگل اور جنگل سے پہاڑ تک کوئی سے ایسی نظر نہیں آتی جو ذرا اصلیت کا رنگ رکھتی ہو۔ بعضے درختوں پر سونے روپے کے پتے لہلہاتے تھے بعضوں پر تاش تمامی کے پھول جگمگاتے تھے۔ ٹہنیوں میں گوہر یکتا اور جوہر بے بہا آویزاں تھے۔ فواروں میں گلاب اور بید مشک پڑا اُچھلتا تھا اور اس کی دھاروں میں سُریلی آوازیں لہراتی تھیں جنگل کی گود کے پالے۔ ہرنیاں اور بارہ صحرا کے دامن میں لوٹ رہے تھے۔ دریا کے پیارے یعنی آبی جانور اور رنگین رنگین مچھلیوں کے لچھے نہروں میں جھلملا رہے تھے۔ پرندے بھی بے شمار تھے۔ مگر اکثروں کی چونچیں سُنہری تھیں۔ اکثروں کے بازو ہیرے اور یاقوت سے تراشے تھے۔ اس پر نغمہ سنجی کا یہ عالم تھا کہ اُن کے سامنے شعرا کی غزل خوانی کا دم بند ہوتا تھا۔ پھولوں نے ہوا کو عبیر و۔ لوبان، مشک و زعفران سے بسا رکھا تھا۔ عطر کی لپٹیں چلی آتی تھیں۔ اور بہ ملی جگی

خوشبوئیاں الگ الگ کیفیتیں دیتی تھیں - گویا روشن ہوا پر گلکاری کے تختے کھلے ہوئے ہیں - باوجود اس کے صبا و نسیم کے دامن عاشقان مہجور کی آہوں سے بھرے ہوئے تھے اور جو موجِ ہوا تھی حسرت زدوں کے پیاموں میں اُلجھی ہوئی تھی -

میں اس دشت سحر نگار میں اِدھر اُدھر پھرتا رہا - آخر اُن عجائبات کو دیکھ کر مجھ سے بولے بغیر نہ رہا گیا - اور آپ ہی آپ باتیں کرنے لگا - مگر یہ معلوم ہوتا تھا کہ جو میری آواز گونج کر پلٹتی تھی - وہی میری باتوں کا جواب ہوتی تھی - باوجود اس کے کبھی اتفاق کرتی تھی کبھی تردید کرتی - غرض اُن دیکھے ہمراہیوں کے ساتھ باتیں کرتا چلا جاتا تھا جو ایک غار کے سرے پر پہنچا - دیکھوں تو اندھیرا گھُپ ہے - آگے بڑھا تو ذرا آنکھیں روشن ہوئیں - اور معلوم ہوا کہ ایک عمارت عالیشان بنی ہوئی ہے - اُس کے دروازے پر جو اشعار سونے کے حرفوں سے لکھے ہوئے تھے - اُن سے معلوم ہوا کہ یہ خیال پرستوں کا مندر ہے - اور ایک دیوتا مہاراج اُس کے دروازے پر بیٹھے ہیں کہ عالم حماقت کے فرمانروا ہیں سر پر دستار سرگردانی ہے اور تاج کی جگہ ایک سرو سر پر باندھ لیا

ہے ۔ قلندرانہ لباس پہنے ہیں۔ ایک ہاتھ میں کتاب لئے ہیں۔ دوسرے
میں جھنجھنا ہلاتے ہیں۔ داہنے ہاتھ کی طرف محنت بیٹھی عرق ریزی کر رہی ہے
اور آگے چراغ جل رہا ہے۔ بائیں ہاتھ پر تلوّن مزاجی کھڑی ہر دم نیا
رنگ بدل رہی ہے۔ کندھے پر ایک عجیب الحرکات یعنی بندر بیٹھا اچھل
رہا ہے۔ وہ کبھی جھک جھک کر سلام کرتا ہے۔ کبھی منہ چڑانے لگتا ہے
کبھی ٹہنیاں ہلانے لگتا ہے۔ اس کے پیش قدم بھینٹ چڑھانے کی
عجیب ڈھنگ کی بنائی تھی۔ اور پیچھے معلوم ہوا۔ کہ فی الحقیقت وہ ایسی
ہی تھی۔ جیسا اس کے گرد لکھا ہوا تھا۔ بہت سی بھینٹ اور قربانیاں
وہاں چڑھی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ اکثر صورتہائے بے معنی کے جانور
وہاں لٹکے تھے۔ جن کا نام ان کے معتقدوں نے نازک خیالی اور
رنگین بیانی رکھا تھا۔ یہ جانور حروفِ بے آواز اور آوازِ بے حروف
کے زمزمے بھرتے تھے۔ جن کا خلاصہ یہ تھا کہ سراسر مضمون مدعا
غائب۔ بہت سے متشابہ صورت کی طوطیاں اور غلط نما بلبلیں
تھیں کہ کبھی نظر آتی تھیں۔ کبھی غائب ہو جاتی تھیں۔ اکثر نیم بسمل پڑے
تڑپتے تھے۔ معلوم ہوا کہ تشبیہوں اور استعاروں کا گنج شہیدان ہی ہے۔ ڈھیر ایک جگہ میں

نظر آتی تھیں کہ اہل محفل میں کسی کی ایک آنکھ کسی کی دونوں آنکھیں بھینگی تھیں۔ جو بھینگے نہ تھے۔ وہ طاقی تھے۔ معلوم ہوا کہ انھوں نے تجنیس اور ایہام وغیرہ صنعتوں پر اپنی آنکھیں قربان کر دی ہیں۔ ایک طرف زمین شعر میں درخت بنا کر کھڑے کر دیئے تھے۔ مگر ثمر اصلا نہ تھا اور ثمر تھا تو مزیدار نہ تھا۔ یہ مندر اُن کے پجاریوں اور مہنتوں سے بھرا ہوا تھا۔ جن کی آنکھیں تو بند تھیں مگر وہم و وسواس اُنگلی پکڑے انہیں لئے پھرتے تھے۔ اور جن جن شغلوں میں لگا دیتے تھے اُنہیں میں لگ جاتے تھے۔ ایک طرف ایک پلٹن تھی۔ فقط ہیرے پھیرے کرتی پھرتی تھی۔ اس کا نام قواعد رکھا۔ کبھی ننگے سر ہو جاتے تھے۔ کبھی ایک ننگے سر اور ایک ننگے پاؤں ہو کر گنڈے دار ہو جاتے تھے کبھی کھڑے ہو جاتے تھے کبھی دوہرے ہو جاتے تھے کبھی سب باہم گلے میں ہاتھ ڈالکر لوٹ جاتے تھے۔ اضطراب اور گھبراہٹ نے ایک خلط ملط کتاب بنا کر اُن کے ہاتھ میں دیدی تھی۔ اسی کے

؎ یعنی بے نقط یا منقوط۔ یا فقط اوپر ہی نقطے ہوں یا نیچے ہی نقطے ہوں یا حروف اس کے ایک ایک الگ الگ تحریر ہوں۔ یا سب کے سب ملا کر لکھے جا سکتے ہوں۔

بموجب اُن کی قواعد تھی آگے دیکھتا ہوں کہ ایک مجمع ایسا کھڑا ہے۔ گویا دربار کو جانا ہے۔ اتنے میں ایک ننگا آدمی آیا اور برابر سب کی پگڑیاں اُتارتا چلا گیا۔ کہ لپیٹے لئے کپڑے بنائے۔ معلوم یہ ہوا کہ کوئی شاعر ہے کہ ابجد کا عمل کر کے کسی بادشاہ کا نام نکال رہا ہے۔ اُن سے آگے اور بھی اعلیٰ درجہ کے لوگ نظر آئے۔ دیکھتا ہوں کہ بہت سی کرسیاں بچھی ہیں۔ اُن پر کچھ اشخاص کھڑے ہیں۔ کسی کے ہاتھ میں ایک ریت گھڑی ہے۔ کہ وقت کا اندازہ بتائے۔ کسی نے ایک دائرہ کھینچ کر ہاتھ میں لے لیا ہے اور مُنہ سے نفیری بجا رہا ہے۔ مگر بات کسی کی سمجھ میں نہیں آتی۔ معلوم ہوا کہ ایک امیر کا بیاہ ہوا ہے اور ایک کے گھر لڑکا پیدا ہونے والا ہے۔ یہ اُن کی تاریخیں کہہ رہے ہیں۔ اور ایک طرف دیکھتا ہوں کہ دو رُخے انسان بیٹھے ہیں۔ مگر مُنہ سے کچھ نہیں بولتے۔ معلوم ہوا کہ یہ ایسے فقرے اور شعر ہیں جو اُلٹے سیدھے دونوں طرف سے پڑھے جاتے ہیں۔ مگر لطف معنی ندارد مندر کی مغربی جانب میں دیکھا کہ چند اشخاص نہایت محنت کے

کام میں مصروف ہیں اور بہت سے ڈھیر اُن کے آگے پیچھے پڑے ہیں۔ اُن سے میں نے پوچھا کہ صاحب کیا کر رہے ہو؟ بولے کہ معموں کا ذخیرہ تیار کر رہے ہیں۔ کیونکہ دیوتا کو اس سے زیادہ کوئی بھینٹ نہیں بھاتی۔ اِن ڈھیروں میں ایسی طرح بہ طرح کی چیزیں تھیں کہ ایک کو دوسرے سے نسبت نہ تھی۔ بہت سی گڑیاں بھی بندھی تھیں اور لکڑی کے انبار کی طرح اوپر تلے پڑی تھیں۔ اُنہی میں ایک جگہ لنگر لنگوٹے ایک طرف جُبّے اور عمامے۔ پھر انہیں میں پشواز اور پاؤں کے گھنگرو چھوٹی بڑی تھیلیوں میں پوٹلیوں میں بندھے اٹم لگے ہوئے تھے۔ ایک گٹھڑی میں سے ایک کاٹ کے گھوڑے کا سر بھی نکلا ہوا تھا۔ میں وہاں سے گھبرا کر چلا۔ اتنے میں ایک کاریگر نے مجھے متحیر دیکھ کر پکارا کہ جناب ایک پوٹلی میں گنج کے گنج نازک خیالیاں ہیں۔ اگر آپ کہیں تو دکھاؤں۔ میں نے سلام کے ساتھ اُس کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ معاف کیجئے۔ اس وقت مجھے ایک نہایت ضروری کام ہے۔

میں مندر سے باہر جاتا تھا جو دیکھا کہ بہت سے آدمی آگے پیچھے بے ترتیب ایک جگہ جمع ہیں۔ مگر آمنے سامنے بیٹھے پٹاپٹ قافیہ بازی

لے ہے۔ اپنی تنگ بندی پر آپ ہی آپ خوش ہوتے ہیں۔ اور تفاخر
کی ٹوپیاں اُچھالتے ہیں۔ ابھی ان کے پاس ہی تھا۔ جو دیکھا کہ آگے
دوہری دوہری تہری تہری تنگ بندیاں ہو رہی ہیں۔ اُنہیں سُن کر
میں بے اختیار ہنس پڑا۔ اُن کے پاس ہی دیکھا کہ بہت سے خندہ
جبیں لوگ بیٹھے ہوئے ہیں۔ مگر جسے دیکھتے ہیں اُسے کوئی اور
شخص سمجھ کر ہنسنے لگتے ہیں اور ایسی مسخراپن کی غلطیاں کرنے لگے ہیں کہ
جوڑی جوڑی ہو گئے ہیں۔ ہر جوڑی سر سے پاؤں تک ایک ہی
لباس پہنے ہے۔ مگر اصل میں ایک کو دوسرے سے مناسبت بھی
نہیں۔ کبھی کبھی بوڑھے پر اُنکو لڑکا فرض کر لیتے ہیں کبھی مرد کو
عورت سمجھ لیتے ہیں۔ کبھی حبشی کی جگہ فرنگی بٹھا لیتے ہیں اور اس
پر آپ ہی آپ خوش ہو ہو کر واہ واہ کرتے ہیں۔ میں سمجھ گیا
کہ معموں کا جھمگٹ ہے۔

جب ان طلسمات کو دیکھتے دیکھتے میرا سر پھر گیا تو گھبرا کر وہاں سے
نکلا۔ باہر دو چار کھیت آگے بڑھا تھا جو دفعتاً ایک ہیبتناک غل
اور ساتھ ہی طبلِ جنگ کی آواز آئی۔ اور ایسا معلوم ہوا گویا کوئی

فوج جنگی چڑھی آتی ہے۔ آخر جو میں نے قیاس کیا تھا وہی نکلا یعنی دور سے ایک روشنی کا غبار نمودار ہوا۔ اس کے درمیان ایک مرد باوقار عمارِ حشکوہ سر پر اعزاز کا تاج رکھے گھوڑے پر سوار چلا آتا ہے۔ جو اُسے دیکھتا تھا کہتا تھا کہ سچ ہے اور برحق ہے۔ اس کے دائیں ہاتھ پر اس کا فرزند دلبند خراماں خراماں آتا تھا۔ پشت پر بہت سے ترکش لٹکتے تھے۔ ہاتھ میں چڑھی کمان اور کمان میں تیر جوڑا ہوا تھا۔ اس کا نام حُسنِ بیان تھا۔ جوں ہی ان دونوں کے آنے کی خبر اُڑی۔ ظرافت بے معنی کے تمام ملک میں ایک تہلکہ پڑ گیا۔ عالم حماقت کے دیوتا۔ یعنی اُوت مہابھوت بذاتِ خود اپنی ایک کالی گھٹا کے رنگ میں فوج لے کر اُٹھے بادل کی طرح گرجتے اور مینہ کی طرح برستے سرحد پر آموجود ہوئے اور جن جن نامعقولوں کو میں نے مندر میں دیکھا تھا۔ وہ انبوہ بے تمیزی اندھیری رات کی طرح ایک لشکر کی صورت میں نمودار ہوئے اور جھٹ صفیں باندلیں کہ دشمن کا آگا روکیں جو جو معتقد جاں نثار تھے۔ اُنہیں حکم پہنچا کہ گھوڑے اُڑا اُڑا کر سامنے اچھلو اور لغات کی لفاظی اور مبالغوں کی دھوم دھام سے غل مچاؤ کہ حریف سنتے ہی ڈر کر بھاگ جائے چونکہ حریف بہت آہستہ

کوچ کر رہا تھا اس لئے یہاں کے سرحدی لوگوں کو بھی موقع ملگیا کہ اپنی بھیڑ اکھٹی کر کے الگ کھڑے ہو جائیں اور اُس وقت کے منتظر رہیں کہ اخیر کو میدان کس کے ہاتھ رہتا ہے۔

شائقان سخن ذرا اس بات کا خیال رکھیں کہ یہ سرحدی ملک خوش بیانی مرکّب کے فرقہ ہائے مختلفہ سے آباد تھا یعنی کچھ اصل کچھ بداصل چنانچہ ان کی عجیب شان تھی۔ مردوں کے جسموں پر برچھیاں چبھی ہوئی تھیں۔ عورتوں کی آنکھوں کی جگہ آتشی شیشے لگے ہوئے تھے۔ اگر مردوں کے دل انگارے تھے تو عورتوں کی چھاتیاں برف کی تھیں غرضکہ جیسے عجائب وغرائب مخلوقات سے یہ لشکر آراستہ تھا اُس حالت کی رنگا رنگی بیان کے احاطہ میں محصور نہیں ہو سکتی چنانچہ جب وقت حریف کا لشان نمودار ہوا۔ دفعتہً ان میں ایک ہل چل مچی۔ اور فوراً دو حصے ہو کر ایک حصہ سچ کے سایۂ علم میں جا کھڑا ہوا۔ دوسرا اور جہا بھوت چھوٹے دیوتا کے نشان کے نیچے ہو گیا۔ دیو دروغ اپنا کالا پہاڑ سا ڈیل ڈول لئے چند قدم آگے بڑھے۔ مگر جیونہی سچ کی روشنی اس پر پڑنی شروع ہوئی۔ وہ اس طرح بے معلوم تحلیل ہونا شروع ہوا کہ تھوڑی ہی دیر میں اصلی جسم کی جگہ فقط ایک پرچھائیں سا نظر آنے لگا

آخر ادھر سے مسیح بھی آگے بڑھا۔ جب اس کی روشنی پاس آئی تو وہ دیو روسیاہ بالکل نیست و نابود ہو گیا۔ اور جہاں کالا پہاڑ تھا وہاں خاک سی اُڑ کر رہ گئی۔

تم نے آفتاب کو دیکھا ہو گا کہ جوں جوں نکلتا آتا ہے۔ چھوٹے موٹے تارے برابر چھپتے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ اُن کا نقشِ وجود سامنے کے نصف کرہ سے بالکل محو ہو جاتا ہے۔ اسی طرح یہاں معلوم ہوا کہ دیو دروغ بلکہ سارا لشکر شیطان جو ہمدردی اور جاں نثاری کو حاضر تھا۔ دم کے دم میں ہوا ہو گیا۔ طلسم باطل کا مندر زمین میں غرق ہو گیا۔ مچھلیاں دریاؤں میں چلی گئیں۔ پرندے چڑیوں کی طرح اُڑ گئے۔ جنگلی حیوان جنگلوں میں چلے گئے اور اب زمانہ نے نئے سرے سے اصلی رنگ بدلا یعنی چشموں کی روانی مُرغانِ خوش الحان کے چہچہے، پھولوں کی خوشبویاں۔ روئے زمین کی سرسبزی نے سچا رنگ نکالا۔ اگرچہ میں ابھی پڑا سوتا تھا۔ مگر اس عالم میں ایسا معلوم ہوا کہ اب خوابِ غفلت سے میری آنکھ کھل گئی اور اُن طلسمی عجائب و غرائب کی جگہ پر سرسبز جنگل۔ اصلی نہریں۔ ہری بھری کیاریاں ہو گئیں ہیں۔ جن شعبدوں کے اچنبھے نے میری عقل و حواس کو درہم برہم کر دیا تھا۔

جب وہ سامنے سے دور ہوا تو میں نے خوش بیانی اور صداقت کے جلوے کو نظرِ غور سے مشاہدہ کیا۔ کیونکہ انسان ایک چیز سے نظر اٹھائے بغیر دوسری چیز کو نہیں دیکھ سکتا۔ چنانچہ اِن کے بعد مجھے ایک انبوہ نظر آیا۔ جن میں شاہنامہ کی بحرِ تقارب فردوس کے پھولوں کا تاج سر پر رکھے شمشیرِ برہنہ علم کئے کھڑی تھی۔ خاقانی قصائد کے تاتار میں خاقانِ چین بنا ہوا تھا۔ پہلو میں انوری اور بدر چاچی مضامین سے تور اُڑا رہے تھے۔ خاص خاص قسم کی مثنویاں۔ غزلیں اور رباعیاں اپنے اپنے درجے سے اس کے دائیں بائیں اور پس و پیش آراستہ تھیں۔ نثر اپنے پیادوں کی صفیں باندھ رہی تھی۔ مرثیوں کی نظم و نثر غمناک سنبل سے بال بکھیرے، جامۂ حزن آلود پہنے خاموش کھڑی تھی۔ ہجو کے ہونٹوں پر تبسم تھا۔ مگر خنجر زیرِ قبا لئے کھڑی تھی کہ جدھر موقع پاؤنگی ہرگز نہ چوکونگی۔ فصاحت کا علم نصرت بلند تھا اور اس سے پہچانا جاتا تھا۔ کہ بجائے پھریرے کے اس پر بجلی کوند رہی تھی۔ اس سارے مُرقع کے پیچھے لطائف و ظرائف بھی نسیم و صبا کی طرح خراماں پھر رہے تھے۔ اور درحقیقت مہم کے شروع ہونے سے پہلے انھیں یہاں جمایا تھا کہ ایسا نہ ہو۔ دُشمن سے جاملیں۔ کیونکہ وہ دلوں سے ایک نگاہ

اِدھر بھی رکھتے تھے۔ اُنہیں کے پہلو میں مشاعرہ کا جلسہ تھا۔ اور حافظ اور سعدی کی غزلوں سے شرابِ شیرازی کا دور چل رہا تھا۔ سلطان خوش بیان کے ظہور سے۔ میرے دل پر ایک ہیبت طاری ہوئی۔ مگر ساتھ ہی خوشی کا بھی اثر ہوا۔ اس کی نگاہ موہنی تھی کہ دل سے پیار آتا تھا۔ مگر ساتھ ہی ایسی تیز تھی کہ دل کانپا جاتا تھا۔ اس کی طرف نظر غور سے دیکھ رہا تھا کہ اُس نے اپنے تیروں کا ترکش لے کر مجھے دینے کا اشارہ کیا۔ میں نہایت خوش ہوا اور اس کے لینے کے لئے گھبرا کر ہاتھ بڑھایا۔ مگر ہاتھ جو کرسی سے ٹکرایا تو دفعتہً آنکھ کھُل گئی۔

سیرِ عدم

مُسافرانِ عدم کے پسماندوں کی سرگذشت

جب کوئی نہایت چاہیتی چیز ہمارے ہاتھ سے نکل جائے

اور معلوم ہو کہ اب ہاتھ نہ آئے گی۔ تو کیا دل بیقرار ہوتا ہے۔ جان ٹھہرائے تصوّر میں کیسی اُس کے پیچھے بھٹکتی پھرتی ہے مگر جب تھک کر ناچار ہو جاتی ہے۔ تو اُداس بے آس ہو جاتی ہے۔ اور اپنے ٹھکانے پر گر پڑتی ہے عقل و فہم البتہ دل غمگین کو سہارا دے سکتے ہیں۔ مگر دل ایسا بھولا بھالا شخص ہے کہ ذرا نہیں سمجھتا۔ اور بدعذا اُس کے جی کو چاہتی ہے۔ اُسی کو ڈھونڈھتا ہے۔ درحقیقت یاد جو دل کی ہمسائی ہے۔ وہ ہمیشہ غم کو خانۂ دل میں بلاتی ہے۔ اور ایام گذشتہ میں جو مزے اُٹھائے ہیں۔ یا دولت کھو کر عیش اُڑائے ہیں۔ اُن کی گذری ہوئی بہاروں کے افسانے سُناتی ہے۔ کسی کو اِس دولت و عظمت کا غبار اُڑتا دکھائی ہے۔ جس کی سواری گذر گئی۔ کسی کو اقربا کی آوازیں اور دوستوں کی باتیں سُناتی ہے جو شہرِ خموشاں میں پڑے سوتے ہیں۔ کبھی عزیزوں کی صورتوں اور اُن کی طبیعتوں کی صورتیں دِکھاتی ہے۔ کبھی پیاروں کے پیار اور اُن کی محبتوں کے افسانے سُناتی ہے۔ دل نے حسرت و اشتیاق کو بھی اپنے گوشہ میں رکھ چھوڑا ہے۔ وہ ان باتوں سے ایسے پھولتے اور پھلتے ہیں کہ دل پھٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے۔

گُر زمانہ اور اُس پر وقت کا گذر جانا حالت مذکورہ کو کچھ کچھ کمزور کرتا ہے
ساتھ اس کے یا تو عقل و فہم آ کر حسرت و اشتیاق کو دبا تے ہیں۔ یا کوئی
اور باہر کا شوق اُن سے بھی زبردست آتا ہے وہ اُن کا زور گھٹاتا ہے
نہیں انہیں خیالات میں پڑا تھا جو نیند آگئی۔ دیکھتا ہوں کہ گویا ایک چٹیل
میدان صحرائے بیابان سمندر کا کنارہ ہے اور میں وہاں بہت سے
لوگوں میں کھڑا ہوں۔ کہ جن کے سوگوار چہرے اُن کے دل کے غم و
اندوہ کی گواہی دیتے ہیں۔ ہمارے سامنے جو دریا بہہ رہا تھا۔ اُس کا
چپ چاپ بہاؤ اور سناٹے کا چڑھاؤ پکار رہا تھا کہ یہاں تھاہ کا پتہ
نہیں۔ اس دریا کو دریائے اشک کہتے ہیں۔ اُسی دریا میں ایک
ٹوٹی پھوٹی سی کشتی بھی پڑی ہوئی تھی۔ چنانچہ معلوم ہوا کہ بہت سے
مسافر پار جانے والوں نے اضطراب اور بے صبری سے اس میں
بیٹھ بیٹھ کر اُسے خراب کر دیا ہے مصیبت اس کشتی پر ملاحی کرتی تھی۔
چنانچہ وہ فوراً ہمارے پاس لے آئی۔ ہم بھی سوار ہونے کو تیار
تھے کہ اتنے میں ایک بی بی دیرینہ سال شرم و حیا کا برقعہ اوڑھے
حلم کی لاٹھی ٹیکتی آئی۔ شفقت مادرانہ سے ایک ایک کا نام لے کر

پکارا اور سفرِ دریا کے خطر بیان کرنے لگی۔ تاکہ ہم کسی طرح سے اپنے ارادہ سے باز رہیں۔ اکثر لوگوں نے اُسے پہچان لیا کہ بی بی صابرہ خاتون ہیں چنانچہ بعض اشخاص جو رو رو کر آنکھوں سے دریا بہا رہے تھے۔ انہوں نے اُس کا کہنا مانا۔ اور پیچھے ہٹ آئے۔ باقی ہم میں سے سوار ہوئے۔ بڑھیا بیچاری کی نیک ذاتی اور اُس کے دل کی بدخواہی نے مصیبت زدوں کا ساتھ چھوڑنا گوارہ نہ کیا۔ اور کہا کہ اے فرزندو اگر تم کہو تو میں بھی تمھارے ساتھ سوار ہو لوں۔ کہ بھلا اگر سفر میں وقت پڑے تو تمھیں تسکین یا صلاح مناسب تو دے سکوں۔

غرض ہم کشتی میں سوار ہو کر سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ کشتی چل نکلی۔ اور بادبان کھل گئے۔ مگر ان بادبانوں میں فقط آہوں کا دھواں بھرا تھا۔ کیونکہ اس ملک کی ہوا ہی تھی۔ رستے میں اگرچہ بہت سے صدمے اور نہلکے اُٹھائے۔ مگر اکثر لوگ ہم میں ایسے تھے کہ اُنہیں اس کی پرواہ بھی نہ تھی۔ غرض بہزار دقت کشتی کنارے پر لگی۔ جب پار اُترے تو دیکھا کہ ایک جزیرہ ہے۔ مگر وہاں ایسی دُھند چھائی ہوئی تھی کہ سورج نے اپنی شعاعوں کے ہزاروں تیر مارے۔ ایک پار نہ جا سکا۔ سامنے

گویا صدمۂ غم سے سکتہ کا عالم ہو گیا ہے۔ اِن حالات کو دیکھ کر اور آوازوں کو سُن کر ہمارا غم اور بھی زیادہ ہوا۔ بلکہ ایک رفیق تو ایسا بے تاب ہوا کہ رستے پر ایک درخت کا ٹہنا جھکا ہوا تھا۔ اُس نے ارادہ کیا کہ اِس میں لٹک کر رہ جائے۔ مگر ساتھیوں نے تسلّی دلاسا دے کر سنبھالا۔

اَب ہم چلتے چلتے ایسے مقام پر پہنچے کہ زمین آسمان اندھیر اور بالکل سُنسان مقام تھا۔ جنگل کی سائیں سائیں ٹھنی ٹھنی سے رونے کی آواز ہوا کا گھٹاؤ دلوں کے دھڑکنے سے جب ہمارا حال بہت ابتر ہوا تو سب کو یقین ہو گیا۔ کہ اَب ہم کُنجِ غم کے پاس آ پہنچے۔ وہ ایک گہری گھاٹی کے بیچ میں اندھیر گھُپ ایک لمبا غار تھا۔ اُسی کے رستوں کے اِیچ بیچ میں کچھ کچھ پانی بھر رہا تھا۔ مگر عجب رنگت پائی تھی کہ نہ کالی نہ لالی وہی نیلا پیلا کیچڑ پانی تھا کہ نالہ وزاری کی آوازوں پر آہستہ آہستہ سرسراتا تھا اور مارے غم کے دل کے لہو کو پانی کر کے بہاتا تھا۔ غار مذکور کے اندر ایک تہ خانہ تھا جس کے دروازے پر آہ کے قلم اور تیرہ تختی کی سیاہی سے لکھا تھا کہ کلبۂ احزان کا دہاں غم یہی ہے اندر اِس غارِ مصیبت کے دیو غم انجام کا وجود بدنمود نظر آتا تھا۔ اس کے رستے میں کوڑا کانٹے

ایک بھیانک اندھیرا اِس طرح پھیلا ہوا تھا کہ جو لوگ ہم میں ذرا دلوں کے نرم تھے۔ وہ تو اس مقام کو دیکھ کر سخت گھبرائے۔ اور ناچار ہو کر صبر کے دامن کو ہاتھ لگایا۔ چنانچہ اُس نے ایک طرف کو اِشارہ کیا۔ وہ ہمیں یہیں چھوڑ کر اِدھر اُتر گئے۔ پھر یہ بھی ہم نے سُنا کہ اُس کے پتے کے بموجب جزیرہ کی سرحد پہ پہنچکر اُنہیں ایک پایاب مقام ہاتھ آگیا۔ میں ابھی تک انھیں لوگوں کے ساتھ تھا جن کا یہ ارادہ تھا کہ جزیرہ کے بیچوں بیچ میں ہی جاکر دَم لیں گے۔ چنانچہ وہ سب نہایت آہستگی اور سنجیدگی سے جیسے کوئی جنازہ کو لئے جاتا ہے چلے جاتے تھے۔ انہی ہمسفروں کے حلقۂ رفاقت میں میں بھی چلا جاتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہم ایک سرسبز بن میں جھاڑیوں کے اندر اندر چلے جاتے ہیں اور اُن درختوں کو قبرستان پر ہی سایہ کرنے کا عشق ہے۔ یہاں کچھ آدمی بھی رہتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ مگر وہ بھی نالہ و زاری میں مصروف تھے کہ کسی طرح انھیں تسکین نہ ہوتی تھی۔ کوئی شاخِ درخت کو پکڑے کھڑا تھا اور زار زار روتا تھا۔ کوئی اپنے ہاتھ کو مروڑتا تھا اور دِل مسوس کر رہ جاتا تھا۔ کوئی چھاتی پیٹتا تھا اور بال نوچتا تھا۔ کوئی خاموش تھا۔ مگر ایسا معلوم ہوتا تھا

اور سانپ بچھوؤں کے ڈنک بکھرے ہوئے تھے جس تخت پر اس کا
جلوس حاکمانہ تھا وہ ایک ٹوٹی پھوٹی پہاڑی کی چٹان تھی تکیوں کی جگہ
پیچھے اور پہلوؤں میں کئی کڈھنگے بیڈھنگے پتھر ڈال دیئے تھے۔ سر پر
تاج بے کلاہی دھرا تھا جس پر اندھا دھند اندھیرا چھایا ہوا تھا اور یاس کے
غم کے مارے سر کو بازو پر سہارا دیئے ہوئے تھا۔ اس شان سے اپنی
غم پرست و غم آئین رعایا پر حکمرانی کرتا تھا اور افسردہ پژمردہ چپ چاپ
خاموش خود اپنے خیال میں گم ہو کر حماقت کی تصویر بن گیا تھا۔

اس کے ایک طرف ملامت وافسردگی کھڑی تھیں کہ مارے ضعف
کے جھکتے جھکتے نقش زمین ہو گئی تھیں۔ لوگ کہتے تھے کہ غش آگیا۔
دوسری طرف فکر تھا کہ دم بدم کی سرگوشی سے ہزاروں وہم وسوسوں
کے عذاب میں گرفتار تھا۔ زردی سر پر کھڑی رومال ہلاتی تھی۔ کہ رنگ
دھواں ہو کر اُڑے جاتے تھے۔ پہلو میں درد بیٹھا تھا کہ جونک کی طرح
اندر لہو پیئے جاتا تھا۔ تمام غم خانہ میں ویرانی۔ بربادی چھائی ہوئی تھی
اور اس کھنڈر کے چھیدوں میں کئی چراغ سحری بھی ٹمٹما رہے تھے۔ جن
کے نیلے نیلے شعلے اُٹھتے تھے اور اپنی ہی نیلاہٹ میں بیٹھ کر اُٹھ کھڑے

ہوتے تھے کہ وہ غم کی حالت اصلی کو اور بھی زیادہ خوف سے روشن کرتے تھے جب ہم وہاں پہنچے تو اکثر لوگ رستے کے دُکھوں کے مارے جاتے ہی گر پڑے۔ چنانچہ جو ظالم ستم گار تخت کے آس پاس کھڑے تھے اُن کے حوالے ہو گئے۔ بعض خوش نصیب تھے کہ رنج و عذاب سہتے سہتے دروازے کی طرف بھاگے۔ وہاں بی بی صابرہ خاتون اُن کے استقبال کے لئے منتظر کھڑی تھیں۔ کیونکہ جب ہم اندر گئے تو اس بیچاری کو چھوڑ گئے تھے۔ اس کی رفاقت ایسے وقت میں نہایت غنیمت معلوم ہوئی چنانچہ اس نے ہمیں اِس کلبۂ احزان کے گرد ایک چکر دیا۔ جب پچھواڑے کی طرف آئے تو ایک بلندی نظر آئی۔ اس پر چڑھ کر دفعۃً معلوم ہوا کہ گویا ہم اِس ماتم زدہ کے نکاس کی راہ پر آ گئے۔ اس بلندی پر اُس نے کہا کہ فرزندو! یہاں ذرا ٹھہر کر دم لو کہ تمھارے ہوش و حواس ٹھکانے آ جائیں۔ چنانچہ فی الحقیقت خمارِ غم کی سرگرانی سے آنکھیں ہماری جو زمین پر لگی ہوئی تھیں اب ذرا کھلتی معلوم ہوئیں۔ اور ایک قسم کی خوشی محسوس ہوئی جس نے زبانوں پر تسکین کا مزہ دیا۔ یا تو دُنیا اندھیر معلوم ہوتی تھی یا ایسا معلوم ہوا گویا ہم چھاؤں میں ہیں

یہاں ہم نے اپنے ہمراہیوں کے شمار پر بھی خیال کیا۔ کہ کتنے لوگ جزیرہ میں داخل ہوئے تھے۔ چنانچہ اُن کی کثرت سے دل کو ایک اور قسم کی خوشی ہوئی۔ جس کو تسلّی سمجھنا چاہیئے۔ ہرچند کہ یہ خوشی کہ اوروں کو مبتلائے غم دیکھ کر حاصل ہوئی تھی۔ معیوب ہے۔ مگر اس وقت قابلِ قدر تھی۔ کیونکہ وقت کو خیال کرو۔ یعنی دیکھو کہ ہم خود کس آفت میں مبتلا تھے۔ اسی واسطے ہم کو فقط اُن کے حالِ زار پر رحم نہ آیا۔ ہاں یہ افسوس آیا۔ کہ ہائے ہم سب کیسی بے کسی اور بے چارگی کی حالت میں گرفتار ہیں۔ بلکہ اُس میں کچھ اُنس انسانیت اور رحم ہمدردی بھی شامل تھا۔

اگرچہ دل اس وقت ایسے اندھیرے اور عالمِ مدہوشی میں تھا۔ کہ اُسے کسی بات کا ہوش نہ تھا۔ مگر جوں جوں آگے بڑھے۔ ہوش میں آتا گیا۔ تھوڑی دور چل کر ایک دوسرے کو پہچاننے لگے۔ بلکہ ایک ایک کو غمگین دیکھ کر پوچھنے لگا۔ کہ ہم کب ملے تھے۔ اور وہ کیا بیتیں تھیں کہ جن کے لئے ہم سب جمع ہوے تھے۔ ہر ایک نے اپنی سرگذشت بیان کی۔ سارے ماجرے سُنکر سب نے ایک دوسرے کی تکلیف کو تولا اور باہم مقابلہ کیا۔ پھر آپس میں رحم کر کے ایک

ایک دوسرے کے حال پر بہت رحم کئے۔ غرض اِس طرح غمناک قافلہ نے رفیقوں کو صبر و تسلی کے توشے دے کر تھوڑی مصیبت کی راہ قطع کی۔ آخر ان درختوں کا تنگ راستہ ذرا کھلنا شروع ہُوا اور ہوا بھی کچھ کچھ صاف ہونے لگی۔ تھوڑی دور سے صبح کا سفیدہ غبار کی طرح اُڑتا نظر آیا۔ وہ ایسا ذرہ ذرہ کر اُبھرتا تھا جیسے کہیں دور بجلی چمکتی ہو۔ چمکارے ذرا اس کے مانند تھے۔ مگر باوجود اس کے دل کو فرحت بخشتے تھے۔ چنانچہ اس ملک میں اُسے دل کا بہلاوا کہتے تھے۔ تھوڑی دیر میں یہ روشنی زیادہ نظر آنے لگی۔ اور پھر زیادہ تر روشن اور دیر تک ٹھیرنے لگی۔ بعد اس کے وہ آہیں جنھوں نے اب تک زمین و آسمان کو دُھواں دھار کر رکھا تھا۔ نسیمِ صبح کی سرسراہٹ بن گئیں۔ اور تمام جزیرہ پر جو دیو ہیبت کا سایہ چھایا ہوا تھا، وہ بھی کم ہونے لگا۔

اب ہم چلتے چلتے اُس پایاب مقام پر پہنچے جہاں سے ہمیں پار اُترنا تھا۔ یہاں دیکھیں تو وہ ماتم زدے بھی بیٹھے ہیں جو پہلے ہمارے ساتھ سے اِدھر اُترے تھے اور پھر کلبۂ احزان کے

دروازہ سے گھبرا کر بھاگے تھے۔ لیکن یہاں بیٹھے انتظار کر رہے تھے۔
کہ جس طرح ساتھ اِدھر آئے تھے ساتھ ہی پھر دُنیا میں دوبارہ پیدا
ہوں۔ جس سے یہ معلوم ہو کہ یہ بھی کلبۂ احزان کی تکلیفوں میں شریک
حال تھے۔ اگرچہ اور طرف پانی بڑا گہرا تھا۔ مگر اِدھر بالکل پایاب تھا۔
جب ہم دریا اُترے تو تمام دوست آشنا استقبال کو آئے۔ کیونکہ
اُنہیں ہماری عمر دوبارہ کی مبارکباد دینے کے لئے تسلّی
بُلا کر لائی تھی۔ ان میں سے بعض تو ہمیں اتنے دن تک جدا رہنے کے
لئے ملامت کرتے تھے۔ بعض کہتے تھے کہ خیر جو ہوا سو ہوا۔ پھر ادھر
جانے کا ارادہ نہ کرنا۔ بعض دانشمندوں سفر کا حال بھی نہ پوچھا کہ مبادا
پھر رنج تازہ ہو جائے۔ مگر یہ ہر شخص نے کہا کہ اگر تقدیر سے ایسا
سفر پیش آئے تو صبر سے بہتر کوئی رفیق راہ نہیں۔ یہاں صبر نے چاروں طرف
سے اپنی تعریفیں اور شکریے سُن سُن کر ہمیں تسلّی کے سپرد کر دیا۔ تسلّی نے اس پر
تبسّم کیا۔ تبسّم کے ساتھ ہی اُدھر سے آسمان کا رنگ ارغوانی ہو گیا اور
شب ماتم صبح ہو کر روز روشن بن گئی۔

حضرتِ آزاد کا جلسۂ خیال ختم ہوا

(طاہر)

بقائے دوام

اے خیالات کی بلند پروازیوں کے ماننے والو! اے وہم کے چھلاوے کی پرچھائیں کو دوڑنے والو۔ ذرا دل کے کان لگا کر سنو۔ آج تمہیں وہ عجیب و غریب قصّے سنائیں گے۔ اور وہ آن دیکھے جلوے دکھائیں گے کہ عقلِ انسانی ہوش و حواس کے پردوں کو توڑ کر فنا و بقا کا ساز چھیڑے گی۔ اور نام و نمود کے رسیلے سروں سے دل و دماغ میں پھر ایک دفعہ شہرت عام اور بقائے دوام کے لئے متوالا خون دوڑے گا۔ کہ اس کی اُمّید افزا قوتوں سے جوانی کی خون شدہ آرزوئیں بڑھاپے میں ضرور بر آئیں گی۔ اور کل کی ناکامیاں آج کامرانی سے بدل جائیں گی۔

دل کہ ایک دن افکار حوادث سے پژمردہ اور زمانے کی نیرنگیوں سے افسردہ تھا۔ غم غلط کرنے کے لئے عجائب خانہ نیرنگ خیال میں جا نکلا۔ جہاں پہنچکر آغاز آفرینش کی سیر کی۔ سچ اور جھوٹ کے معرکہ ہائے رزم کا مشاہدہ کیا۔ گلشن بہار کی اُمّید سے لطف

اُٹھاتا۔ سیر زندگی سے دل بہلاتا۔ شہرت عام اور بقائے دوام کے دربار میں جا پہنچا۔ یہاں کی دربارداریوں نے تو ایسا محو کیا کہ اپنے تن بدن کی بھی خبر نہ رہی اور بار بار سوچتا تھا کہ آخر اس خالی کرسی پر حضرت آزاد اب تک جلوہ گر کیوں نہیں ہوئے۔

انہیں خیالات میں غرق تھا کہ بیخودی نے ہوشیاری کو اشارہ کیا۔ اور محویت نے خیال کو خواب سے بدل دیا۔ پھر استغراق کے گاؤ تکیہ پر ہاتھ تھا۔ اور ہاتھ پر مخمور سر۔ کہ عالم خیال میں دیکھتا ہوں کہ میں ایک سمندر کے کنارے کھڑا ہوں۔ جس کو بہت سے لوگ عدم آباد اور بعض بقائے دوام کا بندرگاہ بتاتے ہیں۔ یہاں تھوڑی تھوڑی دیر بعد زندگیوں کے بودے بودے جہاز چھوٹی چھوٹی کشتیاں۔ اُمرا کے اُلٹن بوٹ کے سمندر تھپیڑوں سے چکنا چور ہو کر لنگر ڈالنے کے لئے دوڑے چلے آتے ہیں۔ بعض تو بندر پہنچتے ہی پہنچتے تہ کو جا لگتے ہیں۔ کچھ کنارے لگ کر ساحل کا بھی مُنہ دیکھتے ہیں۔ مگر اُن میں بھی اکثر مُسافر جان سے بیزار۔ کشاکش حیات سے مجبور۔ اُترنے سے پہلے ہی اپنے آپ کو دریائے فنا کے

بھنور میں دے مارتے ہیں۔ باقی جو صحیح و سالم اُترے۔ اُن میں پھر دو فریق بنتے چلے جاتے ہیں ایک فریق تو اپنی بے سرو سامانی کے باعث یہاں کی سُنسان فضا۔ بادِ فنا کی سائیں سائیں موت کی بھیانک بھیانک مورتیں دیکھ کر ہی گردِ باد ہو گیا۔ البتہ دوسرا فریق ذرا مطمئن تھا۔ وہ ذرا سی دیر سستا کر بقائے دوام کے راستہ پر جا پڑا۔

فریق اوّل کہ دُنیا میں اچھے کام انجام دینے سے محروم رہا تھا۔ اور زادِ راہ سے خالی ہاتھ۔ دیکھتے ہی دیکھتے بادِ فنا کے تُند جھونکوں سے ہوا ہو کر اُڑ گیا۔ یہاں تک کہ اس کے نام کا نشان بھی باقی نہ رہا مگر دوسرا فریق کہ حسن خدمات کے امتیازی تمغے اور کارگذاری کی سندیں ساتھ لایا تھا۔ بڑے حوصلے اور ہمت کے ساتھ اُٹھا اور بادِ فنا کا مُنہ موڑتا آگے بڑھا۔ تاکہ ساحل کی تکالیف کی خاک اُڑاتا آئندہ کی کٹھن منزلوں پر گامزن ہو جائے۔ میں جو کہ دیوانہ وار اُن کے کام انجام دیکھنے کا منتظر تھا۔ اُسی گروہ کے قدموں کی اُڑتی ہوئی خاک کے پردہ میں ساتھ ہی ساتھ ہو لیا۔

ابتدا میں ہر طرف ایک اندھیر کا عالم تھا۔ مگر یہاں عقل کی روشنی نے بجلی کا کام کیا۔ اور دور اندیشی کے دوربین نے ایک طرف کو راستہ نکالا۔ اس راہ پر روانہ ہوئے۔ ابھی چند منٹ ہی گذرے تھے کہ وسیع اور فراخ درہ نظر آیا۔ جس کے چاروں طرف ایسے ایسے بلند پہاڑ کھڑے تھے کہ اُن کی چوٹیاں فضائے آسمانی کے رہنے والوں سے سرگوشیاں کرتی تھیں۔ اور پستیاں فرطِ ادب سے اس قدر جھکی تھیں کہ میلوں گہراؤ بنتے چلے گئے تھے۔ غرضیکہ اس نشیب و فراز کو دیکھ کر فرشتۂ عقل کے بھی ہوش اُڑتے تھے۔ مگر سب نے اپنے تئیں سنبھالا اور اس طرف کو روانہ ہو ہی گئے۔ حسنِ اتفاق سے اس میں جانے کے لئے فقط ایک ہی راستہ کھلا تھا جو بڑے پہاڑ کے نیچے سے ہو کر غار کی طرح اندر چلا جاتا تھا۔ جس کی بابت آج تک یہ فیصلہ نہیں ہوا کہ اس ہوشربا دروازے کو قدرت کے سنگ تراش نے تراشا تھا۔ یا حضرتِ انسان کی جوہر کاری کا نمونہ ہے۔

ہم سب مناظرِ قدرت کو دیکھتے اپنے اپنے حال میں مست آگے بڑھے مگر اس عالم میں کچھ ایسا طلسم بندھا تھا کہ ہم ایک دوسرے کو نہ بخوبی

دیکھ سکتے تھے نہ پہچان سکتے تھے۔ غرضیکہ ان کیفیات سے سرشار ہم غار کے دروازے سے باہر نکلے تو یہاں درختوں کا اتنا ہجوم دیکھا کہ آسمان بھی نظر نہ آتا تھا دروازے پر فولاد کے ڈھلے ہوئے خاردار کواڑ چڑھے ہوئے تھے جن کو زمانۂ قدیم کی صنعت کاری نے ڈھالا تھا۔ بوجھوں اس قدر بھاری تھے کہ جب تک انجن اور کلیں مدد کو نہ آئیں۔ تب تک نہ کھلتے تھے۔ نہ بند ہوتے تھے۔

ان کہساروں میں چشمے اور چھوٹی چھوٹی نہریں اس بہتات سے بہتی تھیں کہ وادی کو سرسبزی اور رنگ ریزی میں رشکِ فردوس بنا رکھا تھا۔ پھر ان ساری وساروں نے وادی کے بیچوں بیچ جمع ہو کر ایک تالاب بنا دیا تھا۔ وہ ساگر بڑا ہوا ہمیشگی کی لہروں سے کھیلتا تھا اور خوش آہنگی کی موجوں سے ہلکی ہلکی آوازیں پیدا کرتا تھا۔

اس میں رنگ برنگ کی لال سبز مچھلیاں اُچھلتی پھرتی تھیں جن کی دلفریب چمک سے نظر نار ہو کر بکھر جاتی تھی۔ اس سنہری جھیل کا ادنیٰ کرشمہ یہ تھا کہ قدرت نے جس پرندے کو پانی میں

ہارڈبلو نے سکھائے تھے۔ وہ اسی کشش پر فریفتہ ہوکر تمام سال میں ایک دفعہ ضرور حاضر ہوتا تھا۔ آخرکار اس تمام پانی کا نکاس ایک نہر میں تھا کہ قدرتی بہاؤ نے اس کا راستہ خود بخود نکالا تھا۔ وہ شمال میں غار کی طرف دھائیں دھائیں کرکے گرتی تھی۔ پھر وہاں سے نکلکر سنگستانی نشیب و فراز میں دل بہلاتی۔ پہاڑوں کی چوٹی چڑھتی اور اترتی کہیں سے کہیں غائب ہو جاتی تھی۔

ان پہاڑوں کو سر سے پاؤں تک سرسبز درختوں نے اور گلستانوں کے رنگ برنگی پھولوں نے قلمکار چادریں اُڑھا رکھی تھیں۔ ہوا کے ہر ایک جھونکے کے ساتھ درختوں سے خوشی۔ اور پھولوں کے مینہ برستے تھے اور اس وسیع احاطہ میں جو پیمانۂ نظر سے بھی نہ نپ سکتا تھا۔ ہری ہری گھاس اور خوشنما جھاڑیوں کے چرنے والے کیا اہلی کیا وحشی سبھی طرح کے جانور رہے ہوئے تھے کہ اونچے اونچے ٹیلوں کی آڑوں میں بچنت پھرتے تھے۔ درندے یا شکاری کسی کا کھٹکا نہ تھا۔

اس سدا بہار گلزار سے آگے بڑھے تو ایک پرفضا میدان سامنے

آیا۔ جس کی ہمیشہ رہنے والی بہار خزاں پر کھڑی ہنستی تھی۔ اور اپنے جوبن میں ہر انگڑائی اور ہوا کے ہر ایک جھونکے کے ساتھ ایک نیا نکھار اور نرالا انداز پیدا کر لیتی تھی۔ جو ہر چیز کو اپنی طرف فولاد سمجھکر مقناطیس سے زیادہ کھینچتا تھا اس کے آبشاروں اور روشوں میں سرتوں کے فوارے چھٹتے تھے۔ جن کی پھوار ہر انسان میں کیفیت سرخوشی پیدا کر دیتی تھی۔ صبح کا نوردن بن کر آتا اور مشک وعنبر سے لبریز ذرات خوشبوئیں پھیلاتی چلی جاتی تھی۔

ان امن وامان کے خیابانوں میں ٹہلتے اور نو بہار پٹریوں پر خوش خرامی کرتے ہم سب آگے نکلا چاہتے تھے کہ اس رشک فردوس کے محافظوں نے روک نظام کے تار کھینچکر حد نظر میں محصور کر لیا۔ اور سامنے سے آکر سد راہ ہوئے بلکہ یہاں بھی ہمارے ٹھہر جانے سے مانع آئے۔ اس سختی اور تندی پر ہمارے قافلے میں سے ایک بزرگوار باہر نکلے اور اپنا مطلب ان الفاظ سے ظاہر کیا۔ کہ اے محافظو! اے نگہبانو! تم جانتے ہو۔ ہم کون ہیں؟ ہم وہ لوگ ہیں کہ دنیا کے راحت وآرام و جاہ ومنصب فقط لقائے دوام کے نام پر قربان کر کے یہاں تک آئے ہیں۔ اور اب آرزو ہے کہ ہماری خدمات کے صلہ میں

ہم سب کو شہرتِ عام کے دربار میں ہمارے مراتب مساعی کے مطابق جگہ مل جائے بلکہ ہم میں سے بعض فرخندہ فرجام نفوس تو ایسے ہیں. کہ اُن کے لئے وہاں پہلے ہی سے کرسیاں مقرر ہو چکی ہیں۔ تم کو زیبا ہے کہ ہمارے سدِّ راہ ہونے کے بجائے کچھ امداد اور خاطر و مدارات سے پیش آؤ۔ اور ہم کو ہماری منزلِ مقصود پر پہنچا دو۔

ہمارے ساتھی کی مؤثر تقریر نے جادو سے بڑھ کر کام کیا۔ مگر محافظ قاعدے اور قانون کی پابندی سے مجبور تھے ہم کو تسکین و دلاسے کے اشاروں سے اس جنت نظیر باغ میں ٹھیرنے کی اجازت دی۔ اور خود سُرعت کے گھوڑے پر سوار ہو کر حصولِ اجازت کے لئے ہوا ہو گئے۔ ان کی آن میں کہ اُن پیک ہائے برق رفتار کو سدھارے تھوڑی دیر نہ گذری تھی۔ ایک طرف سے نسیم خوشگوار کے جھونکے عطر بیزی کرتے ہوئے آئے۔ ساتھ ہی وہ پیامبر علاوہ پروانہ اجازت کے مبارکباد کا پیغام بھی لائے بلکہ ایک دو معتبر کارپرداز بھی ہمراہ لیتے آئے تاکہ حقدار کا حق بے حق لوگ نہ مار سکیں۔

اُنہوں نے آتے ہی مبارکباد کا فرنا پھونکا اور سب کو ایک جگہ جمع

کرکے مسند آرائے سماوی کا پیغام سنانا شروع کیا۔ اس میں لکھا تھا اے آنے والو! مرحبا! تمہارا آنا مبارک۔ تمہاری محنتیں اور مجتیں بہت خوش آئیں۔ تمہاری سلامتی کی نوید ہو کہ ملکِ بقا میں تم پہنچ لئے اور اب ہمیشہ اسی میں رہو گے۔ مگر دربارِ شہرت میں اتنی وسعت کہاں کہ تمہارے اس بے شمار گروہ کو عزت و حرمت کے مطابق جگہ مل سکے۔ اگرچہ وہاں کے کرسی نشیں جو تمہی علوم و فنون کے موجد اور مخترع ہیں۔ خود تمہارے ہی اسلاف ہیں۔ مگر چونکہ تمہارے کارہائے نمایاں اُن سے بدرجہا آگے بڑھ گئے ہیں۔ اس لئے ہم نہیں چاہتے کہ وہاں لے جا کر تمہیں نیچے درجوں میں بٹھائیں جس سے تمہیں مایوس اور اُنہیں محجوب ہونا پڑے۔ اس لئے مناسب یہ ہے کہ تم میں علوم و فنون کے لحاظ سے صنف وار تقسیم ہو جائے اور جس سمت جس کا جی چاہے بے دھڑک چلا جائے۔ یہ ملک ختم ہونے والا نہیں۔ جس گلشن میں چاہے اور جو مکان پسند آ جائے وہیں جلسہ جما لے۔ ہماری تائیدیں برکتیں بنکر ہر وقت شامل حال رہیں گی کہ تمہارے آئینِ سلطنت میں اخلاق و مروت کی باتیں قوانین اور ضوابط بن کر داخل ہو گئی ہیں۔

البتہ دربارِ شہرت میں ایک کرسی آزاد کے نام کی خالی پڑی ہے۔ اگر وہ پسند کریں تو بے تکلف چلا آئے۔ کیونکہ سب اہلِ دربار اُس کی مخصوص و مشکور خدمات کی وجہ سے اُس کو عزیز جانتے ہیں اور اُس کی مجالست کے خواہشمند ہیں۔ اس فرمان کے پڑھے جانے کے بعد ایک نور آسمان سے پھیلنا شروع ہوا جس سے فضا میں ہر طرف مہتابیاں سی چھوٹنے لگیں اور ہر ایک ملک کے اربابِ علم و فن اور اصحابِ ایجاد و اختراع نے اپنے اپنے مناسبِ حال قطعے انتخاب کر کے راستے اختیار کئے۔ جب سب بھیڑ چھٹ گئی تو صاف نظر آنے لگا کہ اس پڑاؤ میں تو فقط اُردو کا لشکر ہی چھاؤنی چھائے پڑا ہے۔ بعد میں کسی سے یہ بھی سُنا کہ حضرت آزاد نے اپنے ساتھیوں کا ساتھ چھوڑنا۔ آئینِ مروّت سے بعید جانا۔ اور اُنہیں پیغامبروں کے ہاتھ سب بزرگوں کی خدمت میں پیغام و سلام زبانی کے علاوہ یہ بھی کہلا بھیجا کہ میری کرسی بھی انہیں مربیوں کے ساتھ رہے گی۔ باقی میں ہر طرح خادم ہوں جس وقت کوئی خدمت میرے لائق در پیش ہو۔ بلا تکلف بلا بھیجیے۔ فوراً بے دریغ آؤں گا۔ کیونکہ مجھے آپ ہی بزرگوں کے نقشِ قدم نے یہ خوشی کا دن دکھایا

ابھی ان باتوں کے چرچے ہو رہے تھے کہ ایک نازک خیال نے خبر دی کہ ہم ابھی سیر کرتے کرتے ایک طرف جا نکلے تھے وہاں ایک خطہ ایسا دکھائی دیا کہ باز نظر نے آج تک اس کا نقشہ بھی نہ دیکھا تھا۔ بلکہ خیال کے انجنیئر نے اس کا خاکہ بھی تیار نہ کیا ہوگا۔ اگرچہ اس وقت تک اس باغِ ارم کا پھاٹک بند ہے۔ مگر جالیوں سے اتنا نظر آتا ہے کہ اس رشکِ خلد کے اندر ایک قصرِ عالیشان باغ کے عین وسط میں انگوٹھی پر نگینہ کی طرح جڑا کھڑا ہے۔ وہ اتنا وسیع و رفیع اور ایسا پرشکوہ باعظمت معلوم ہوتا ہے کہ بھول بھلیاں بھی اس کے سامنے آئے تو ستی گم ہو جائے۔ گویا شکوہ فیضہ نے خود اس کا نقشہ کھینچ کر نمونہ دیا ہے۔

اے میرے مکرم و معظم ہمسفرو! ہم سب کو اس طرف جلد چلنا چاہیئے کہ ہمارے مناسب حال اور سب سے الگ تھلگ ہے۔ باقی قطعے تو ہمارے تساہل اور لاعلمی نے کھو دیئے۔ ایسا نہ ہو کہ یہ مرقع ندرت و عجائب بھی ہاتھ سے نکل جائے۔ غرضکہ سب طرف سے بڑھو چلو کی آوازیں آئیں اور یہ باہمت گروہ اس گلشنِ نوبہار کے سجانے والوں سے

اجازت لے کر باغ کی طرف چلا۔ پھر کیا تھا اُسی وقت وہ دروازہ بڑے گاجے کے ساتھ کھولا گیا۔ اور چند گھڑیوں میں دیکھتے ہی دیکھتے اُردو کا عظیم الشان لشکر اس چمن زار رضوانی میں ابر بہار کی طرح پھیل گیا۔

وہاں پہنچتے ہی ہر طرف سے نکہت بار گھٹائیں اُٹھیں۔ نشاط انگیز بدلیاں گھر گھر آئیں۔ مسرت خیز اور دل آویز پھواروں نے پربت تک کو عروسِ نو بہار بنا کر سامنے کھڑا کر دیا۔ اور باغ کا وہ پُرکیف سماں دم بدم دل میں اُترنے لگا۔ وہاں کے خدمت گار کہ فارسی نژاد اور ترک نیچے ہی ہوں گے فوراً ہی شعرا کی خدمت پر جھکے۔ ان بیچاروں نے بھی مدّتوں کے بعد آنکھیں سینکیں۔ اس پر طرّہ یہ ہوا کہ حضرت گلزار باشی نے مدارات اور مہمان نوازی کے سلسلے میں عام اجازت دیدی کہ ہمارے نئے مہمان اپنی تنہائی کا غم۔ منزلوں کا تکان جس شے کو دور ہوتی دیکھیں بے تکلف منگا لیں۔

چنانچہ اس اعلان سے دن عید رات شب برات بن گئی اور جن صناعوں کی صنعت گری اور ندرت کاری مردہ دلوں کو شگفتہ کرتی تھی اُنھیں بلاوے بھیجے گئے کہ آؤ خوشی کا روپ بھر کر اس عید کے ہنگامہ کو

اور چار چاند لگاؤ۔ گویئے اور کلاونت نیچے گانے بجانے میں اپنی ساری اُستادی ختم کرنے لگے۔ راگ رنگ کے ماہرین بھی مہمانوں کے سامنے اپنی کل کل توڑ کر ناچنے لگے۔

اس عیش گاہ میں مزید شوشہ یہ نکلا کہ ہمارے شعرا بذلہ سنجوں لطیفہ طرازوں کی بدولت ایسے گوناگوں سامان فراہم ہو گئے کہ جن سے ان رنگ رلیوں پر ایک سے ہزار رنگ چڑھ گئے اور اسی طرح جشنِ نشاط میں ایک ہفتہ برابر گذر گیا۔ تو سلطان آسمانی کی طرف سے منادی ہوئی۔

چونکہ اس بند محل کے کھلنے کا وقت قریب آیا ہے۔ یہ بزم عیش و نشاط بند اور رزمزمہ اور ہمہمہ موقوف ہونا چاہیئے تاکہ دربارِ عام آراستہ کیا جائے۔ اور ہر زندہ جاوید اپنی جائے مناسب پر ہمیشہ کے لئے متمکن ہو جائے۔ جب اس طرح سکون و طمانیت قائم ہوئی تو سب اپنے اپنے جرگے بنا کر علیحدہ علیحدہ پھٹ گئے تاکہ الگ دروازوں سے اندر پہنچکر اپنے مرتبے اور عزت کے مطابق اقامت گزیں ہوسکیں۔

نشاطِ منتظرہ کے طرب انگیز لمحات غایت اشتیاق و بے تابی کے

ساتھ بسر کرنے کے بعد ابھی صبح کا نور فضائے عالم میں پھیل ہی رہا تھا کہ نفیسوں کی دلکش آوازوں نے خون میں جنبش اور رگ و پے میں حرکت پیدا کی اور ساتھ ہی اس قصر عجائب کے دروازے خود بخود کھلنے شروع ہوئے۔ سب سے پہلے وہی کار پرداز جو سلطانِ آسمانی کی طرف سے درجے اور امتیاز قائم کرنے آیا تھا۔ صدر دروازے سے باہر نکلا۔ اور سب گروہوں کے نام کے تختے علیحدہ علیحدہ دروازوں پر آویزاں کر کے اندر چلا گیا۔ تاکہ سب لوگ اپنی باری پر اندر آئیں اور اپنے مراتب و مناصب کے مطابق بیٹھ جائیں۔ اب میں حیران کھڑا تھا کہ کیا کروں اور کہاں جاؤں کہ اتنے میں قسمت نے یاوری کی۔ اور اسی فرشتۂ رحمت نے اشارے سے اندر بلا ایک گوشۂ خاموشی میں بٹھا کر عجائب بین عینک آنکھوں پر چڑھا دی۔

اس ایوانِ نشست کی سجاوٹ اور بناوٹ کا کیا کہنا۔ گلکاری کی دیواریں ہر طرف گلزار کھلاتی تھیں چھتوں کی جگہ ابری دار پُر بہار پتھر محرابی تراشوں میں کاٹ کر رکھ دئے تھے۔ فرش کے بیل بوٹوں نے نگارخانۂ چین کو مات کیا تھا۔ دیواروں پر دو نوں گیلری.

مقیش کی جھالر کی طرح بل کھاتی تھی۔ غرضیکہ چاروں طرف مانی و بہزاد کی روحیں اہتمام کرتی پھرتی تھیں اور نکتہ نکتہ پر تڑپتی تھیں۔

اس ایوانِ خاص کے بیچوں بیچ صدر میں سنگِ مرمر کا ایک مرصع تخت دھرا تھا کہ پایوں کی بجائے انشا پردازی کے پری چہرہ طاؤس بازوؤں پر لئے کھڑے تھے۔ جب اپنے پروں کو جنبش دے کر تھرتھراتے معلوم ہوتا کہ ابھی آسمان تخیل پر لے اُڑیں گے۔ اس تخت کے دونوں طرف دو علم نصب تھے جن کے ادنیٰ ارتعاش سے ہوا عطر بیز ہو کر دل و دماغ کو تازہ کر دیتی تھی۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ ان کے پھریرے خود شکسپیر اور ملٹن نے اپنے ہاتھ سے تیار کر کے بھیجے ہیں۔ ان پر میر انیس اور مرزا دبیر کی تصویریں کشیدہ کی گئی تھیں کہ خود تو دنیا کی شہرت کو مذہب کے نام پر قربان کر کے سلطانِ آسمانی کے پاس عالمِ قدس میں چلے گئے۔ مگر ان کا کلام ہمیشہ کے لئے اردو زبان کی مردہ روح کو تازگی بخشتا ہے اور وہ روش زباندانی کی بلندی اور محاورہ کی پابندی ہندوستان سے اُڑ کر فردوسی کو شرمندہ کرتی ہے اور استادی کا پھریرا ہوائے اردو میں ہمیشہ لہراتا رہے گا۔ تاکہ بھولے بھٹکے اس سے رستہ پائیں

تھوڑی دیر بعد آمد آمد کی آوازیں آئیں اور رد اخلہ کا طبل گونجا۔ ساتھ ہی ایک طرف سے شور اُٹھا کہ قیامت برپا ہو گئی۔ نیا ہی کے جھکڑ چلے۔ بربادی کی آندھیاں آئیں۔ سینکڑوں سر خزاں کے پتوں کی طرح اُڑتے نظر آئے کچھ ایسا وحشت خیز منظر بندھا کہ غدر دہلی کے افسانے آنکھوں میں پھر گئے۔ ہر طرف سے رونے پیٹنے کی آوازیں نالہ و شیون کی فریادیں کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ کہ مغرب کی طرف سے ایک امن کے بادل کا ٹکڑا اٹھا آیا۔ اور ارمان کے چھینٹوں سے گرد وحشت کا منہ سیلا۔ ذرا سکون ہوا تو اس غبار قیامت آثار میں سے ایک پیر مرد۔ خضر صورت۔ عیسیٰ حکمت برآمد ہوئے۔ تیوری پر کئی بل تھے کہ رنج والم کی زیادتی کی ترجمانی کر رہے تھے۔ تمام کپڑے خون کی بوندوں سے افشاں بن رہے تھے۔ ایک ہاتھ دل پر تھا دوسرے میں تہذیب الاخلاق کا بستہ تھام رکھا تھا۔ گلے میں ایک جھولی لٹک رہی تھی۔ جس پر سنہری لفظوں میں قومی چندہ لکھا ہوا تھا۔ وقار و متانت زیادہ بولنے نہ دیتے تھے۔ مگر جس وقت نصیحت و حکمت کے سکے اُردو کی ٹکسال میں ڈھلکر نکلے تو زبان اُردو پیروں پر لوٹتی اور

اور درد بھرے الفاظ پتھر کو پانی کر دیتے تھے۔ قومی تعلیم و اخلاق کے سدھارنے میں اس قدر غلطیاں و پیچاں تھے کہ اکثر بے خبری کے عالم میں خبر نہ ہوتی تھی مگر دونوں طرف دو بزرگ سفید ریش اور بھی ساتھ تھے کہ دیکھنے والوں کو ہمزاد کا دھوکہ پڑتا تھا۔ وہ لحظہ بلحظہ سنبھالتے تھے اور لئے چلے آتے تھے جب یہ کمرے میں داخل ہوئے تو ہر طرف سے سدا بہار پھولوں کا مینہہ برسا۔ فرشتۂ رحمت نے نہایت تعظیم تکریم سے سنہری کرسیوں پر بٹھا دیا۔ معلوم ہوا کہ پہلے بزرگوار تو مسلمانانِ ہند کے بیڑے کے ناخدا سرسید علیہ الرحمۃ ہیں۔ اور سایہ کی طرح نواب محسن الملک و وقار الملک ساتھ ساتھ ہیں۔ ان لوگوں کے ہاتھوں میں اگرچہ عام خیر خواہی کے گلاب پاش تھے۔ اور جگہ جگہ خوشبو کی جگہ اپنی جان تک چھڑکنے سے گریز نہ کرتے تھے۔ مگر ناقدر شناسوں کی صف میں کئی تیر انداز تھے کہ تعصب کے ترکش میں سے کفر و الحاد کے تیر لیتے اور حسد کی کمان میں جوڑ کر مارہی دیتے تھے۔ جس سے دامن ضرور چھد جاتے تھے۔

ان کے پیچھے پیچھے ایک اور بزرگ صورت، جوان سیرت خراماں خراماں آئے۔ ہمہ تن نیکی اور اخلاق کا فوٹو تھے۔ چہرہ شگفتہ تھا۔ مگر

دل پر کچھ ایسی چوٹ کھائی تھی کہ گھڑی گھڑی گلے میں سے رومال کھینچکر آنسو پونچھ لیتے تھے۔ انہوں نے آتے ہی ایک چھوٹی سی کتاب نکالی اور دونوں ہاتھوں پر رکھ کر سر سیّد کے سامنے نذر گزرانی۔ سر سیّد نے اٹھاکر آنکھوں سے لگائی۔ اور ہاتھ بلند کر کے چاہتے تھے کہ کچھ دعا کریں جو بقائے دوام کی ہوانے اُس کو اُڑا کر سارے جہان پر پھیلا دیا۔ معلوم ہوا کہ وہ مسدس تھی۔ اور یہ خود مولانا حالی مرحوم فرشتۂ رحمت نے ان کو سر سیّد کے پہلو میں مسندِ زرّیں کرسی پر بٹھادیا۔

دردِ محبت کے دروازے کے ساتھ ہی جاہ و منصب کا در بلا ہوا تھا۔ اب کے وہ بھی کھُلا ہیبت اور دبدبہ کے عود دانوں میں انگریزی حیدرآبادی خوشبوئیں روشن کی گئیں تو ایک بزرگوار نہایت تزک و احتشام سے داخلِ دروازہ ہوئے۔ سر پر علم کا طرّہ لپٹا ہوا تھا۔ کندھوں پر ایک بڑا گون پڑا ہوا تھا۔ کہ کئی نازک ہاتھ اُس کو اُٹھائے لا رہے تھے۔ تصانیف کے ذخیرے انبار در انبار ساتھ تھے خدا نے اس شخص کو عجب آتش فشانی عنایت کی تھی کہ ہر لفظ مُنہ سے نکل کر مطلعِ عالم کو روشن کر دیتا تھا۔ اُردو انشا پردازی کے مؤکل آگے

بڑھ بڑھ کر ہاتھ چومتے تھے۔ مگر یہ مسلمانوں کا سیناپتی ہاتھ کھینچکر قومی چندے جمع کرتا تھا۔ اور سر سید کی جھولی میں لا کر ڈھیر کر دیتا تھا۔ اگرچہ تصانیف کے ذخیرے میلوں میں پھیلے پڑے تھے مگر بغل میں ایک حمائل تھی کہ سورج کی چمک کو ماند کئے دیتی تھی۔ یہ اسی پر نازاں تھے۔ کہ زبان اُردو میں اُسی نے بگڑی بات کو بنایا تھا اگرچہ اُن کی حسن خدمات نے ایک جہاں کو گرویدہ کر رکھا تھا۔ مگر حسد کی چھاونی کے سامنے سے ہو کر اُنہیں بھی گذرنا پڑا۔ مُنہ درمُنہ تو کوئی حملہ نہ ہو سکا۔ مگر بیٹھتے ہی پُشت پر ایک کفر کا تیر اس زور سے لگا کہ بیچین کر دیا۔ درمند دوڑے اور پیکان کو کھینچ کر نشانچی کے ہی توپ جیسے بدن میں بھونک دیا۔ یہ ڈاکٹر نذیر احمد تھے۔ ان کو سر سید نے خود اپنے برابر بٹھالیا۔

ان کے بعد علوم و فنون کی خشک ہوائیں سرسرائیں ساتھ ہی باب تاریخ و حساب سے ایک پیرانہ وضع داخلِ محفل ہوئے۔ فکر و غور کرتے کرتے چہرے پر ایسی ہوائیاں اُڑ رہی تھیں کہ پہچان نہ سکتا تھا اور تصانیف کا دفتر اس قدر بے حساب ساتھ لائے تھے کہ دوبار

شہرت میں اس کی سمائی بھی نہ ہو سکتی تھی۔ وہ تو باہر ہی رہا۔ مگر یہ خود اندر آ گئے۔ اُردو نے فلسفہ و تاریخ کا چتر لگا کر حساب کا پا انداز سامنے بچھا دیا اور سب سے بلند جگہ پر بٹھا دیا۔ اگرچہ عوام ہر طرف سے ناک بھوؤں چڑھاتے رہے۔ مگر یہ اپنا کام کئے ہی گئے۔ پتہ چلانے سے معلوم ہوا کہ شمس العلما مولانا ذکاء اللہ یہی تو ہیں۔

اس کے بعد فضائے عالم میں ایک غلغلہ مچا کہ سب کے کان گنگ کر دیئے دید و دیدار کے دروازے کھلے۔ شعر و شاعری کی نسیم چلی بلبلوں نے نغمہ سرائی شروع کی۔ غنچے چٹکے۔ پھول مسکرائے تو سب کی نگاہیں باہر کو لگ گئیں۔ نقیبوں نے خبر دی کہ کوئی مرد میدان اس آن بان سے آیا ہے کہ پہلے آنے والوں کی شان اس کے کلام کے رواج میں روئی کے گالے بن بن کر اڑ رہی ہے۔ ظاہر جاہ و حشم کے علاوہ ہزاروں بادشاہوں کی روحیں سایہ فگن ہیں۔ فارسی شعرا بھی دامن کے ساتھ لپٹے چلے آتے ہیں۔ عرب و عجم کے محدثین بھی رستہ بتا رہے ہیں۔ اگرچہ لباس علما کا زیب بدن ہے، مگر دل گردہ محمود و تیمور کا پہلو میں لئے ہے

یہ جواں مرد کچھ عجیب مسکراہٹ سے دربار میں آیا۔ آتے ہی جلسہ کو گرما دیا بات کرتا شعر پڑھتا۔ تو منہ سے پھول جھڑتے۔ موتی برستے بعض اوقات وہ موتی کچھ آدمیوں کو تعصّب کے شرارے بھی معلوم ہوتے۔ مگر پھر فوراً وہ چنگارے بھی انہیں موتیوں میں مل جاتے۔ زبانِ اُردو کی خدمات کی فہرست پیش ہوئی تو سب ششدر رہ گئے سب کے اتفاق سے تحقیق کا خلعت پہنا کر محققین میں اوّل درجہ پر بٹھا دیا گیا۔ اگرچہ عرب و عجم کے حاسد بہتیرا شور مچاتے رہے کہ اگر یہ محقق ہونگے تو اُردو کے ہوں گے۔ ہم سے کچھ واسطہ نہیں۔ مگر خدمات نے کارگذاری کے رومال سے سب کا منہ بند کر دیا۔ اور ہر طرف مولانا شبلی کا طوطی بولنے لگا۔ اب خاصہ دان نکل آیا۔ رنج و غم کے بادلوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے پھٹ پھٹ کر عیش و نشاط کی گھنگھور گھٹاؤں میں شامل ہو رہے تھے کہ گل و بلبل والے دروازے سے بھی داخلہ شروع ہوا۔ سب کے آگے آگے ایک بزرگ گردن ذرا جھکی ہوئی ضعیف صورت جوان سیرت آئے۔ اُردو شاعری اُن پر فخریہ شعر پڑھتی تھی اور وہ تخیل میں ایسے سرمست تھے کہ خدا جانے انہوں نے

اپنے آپ کو کہاں اور کس حال میں سمجھا کہ بیٹھتے ہی فرمایا ؎

مری ٹوٹی ہوئی توبہ کے ٹکڑے　　اٹھا لا دو در پیر مغاں سے
کہ اُن کو جوڑ کر پھر توڑ ڈالوں　　میں اک جام شراب ارغواں سے

اس پر ہر طرف سے واہ وا کا شور اٹھا اور تعریفوں کے پھول برسے وہ مسکرا لئے اور نہایت عالیشان کرسی پر بیٹھ گئے۔ معلوم ہوا کہ یہ میاں مرزا کے نوشہ کے شاگرد رشید میر مہدی مجروح ہیں۔ اس پر فرشتۂ رحمت نے سخن فہمی کا خلعت اُن کے کندھوں پر ڈال ہی دیا۔

اس واہ وا کے شور میں عشق مجازی کی پتلیاں ناچتی ہوئی نظر آئیں معلوم ہوا کہ یہ سب دو شعراء خاص کو استقبال کر کے لائے ہیں۔ یہ دونوں ایک ہی دفعہ اور ایک ہی دروازے سے اندر آئے۔ ان میں سے ہر شخص محفل کو اپنی طرف مخاطب کرنا چاہتا تھا۔ اور جس طرف منہ کر کے کوئی شعر پڑھ دیتا تھا۔ پرے کے پرے اُس پر تعریفوں کے ساتھ جھکے پڑتے تھے۔ دوسروں کی نکتہ چینیوں کے علاوہ خود بھی کبھی کھلم کھلا چوٹیں کرتے تھے۔ مگر اس میں زبان لطف سخن سے آسمان پر پہنچ جاتی تھی۔ معلوم ہوا کہ ایک امیر مینائی لکھنوی اور دوسرے مرزا داغ دہلوی

مرزا داغ کی عوام پسند غزلیں ہر طرف اس زور سے گونجیں کہ امیر مینائی اس رنگ سے گھبرا گھبرا گئے۔ مگر وقت کی مجبوری اور پسندِ عام پھر ادھر کو لے آتی تھی۔ ان حالوں کو دیکھکر حضرت جلال لکھنوی لے آگے بڑھے اور ان دونوں کے ہاتھ تھام اِدھر اُدھر لے کر بیٹھ گئے۔

سب اہلِ مجلس تو اس منظر میں مست تھے کہ ایک خاموش ہستی ایک طرف سے آکر سب شعرا کے پیچھے آکر کھڑی ہو گئی۔ جب کیفِ سخن سے طبیعتیں ذرا سنبھلیں تو سب استقبال کو کھڑے ہوئے۔ خاندانی جاہ و جلال کے لحاظ سے آنکھوں پر بٹھایا۔ اُنہوں نے کچھ عجب انداز سے اشعار اور رباعیاں سنا کر سارے جہان کو مسحور کر لیا۔ کلام اگرچہ مستانہ اور نصیحت انگیز تھا۔ مگر کہیں کہیں غم کی جھلک صاف نظر آتی تھی۔ معلوم ہوا کہ دودمان گو گران سے مولانا ارشد ہی ہیں۔

اب مشاعرہ خوب گرم ہو چکا تھا۔ فصاحت و بلاغت کی ہوائیں چلیں تخت کے آس پاس جو دو علم بندھ رہے تھے اُن کے پھریرے لہرائے واہ وا۔ لے سبحان اللہ کا شور اٹھا۔ تو سامنے کے بڑے دروازے سے شعرا کا جھرمٹ آتا دکھائی دیا۔ وضع قطع اہلِ لکھنؤ کی سی تھی۔ مگر

جو صاحبِ فن آگے آگے رستہ دکھاتے چلے آتے تھے۔ اُن کے لفظ لفظ پر دلی والوں کے کان کھڑے ہو رہے تھے۔ اور اپنی ہموطنی کی خوشبو آتی تھی۔ وہ بلند و بالا۔ مگر نحیف و نزار۔ لاغر اندام۔ سُرخ و سپید، چہرے پر بڑھاپے نے جھرّیاں ڈالکر رونق بڑھادی تھی۔ اِن کے آنے پر پسندِ عام کے شور مچے۔ وہ پہلے میر انیسؔ کے جھنڈے کے پاس کھڑے ہوے ٹیکے کو آنکھوں سے لگایا۔ بوسہ دیا اور وہیں کھڑے کھڑے رعشہ دار ہاتھ اٹھا کر یہ رباعی پڑھی ؎

کب میری طرح شباب دیکھا ہوگا ۔۔۔ ایسا بھی نہ انقلاب دیکھا ہوگا
پیری کہتی ہے کہ خواب دیکھا ہوگا ۔۔۔ کہتا ہوں جو میں کہ تھی جوانی میری

سب کے مُنہ سے بے ساختہ ہائے نکلا اور تحسین کے سُر ہلے تو سب نے پہچانا کہ میر انیسؔ کے نواسے میر عشق و تعشق کے سرمایۂ شاعری حضرت پیارے صاحب رشید لکھنوی ہیں۔ جنھوں نے مرثئے کی میراث ہوتے ساتے غزل اور رباعی کے ملکوں پر زبردستی قبضہ کرلیا ہے۔ سب نے ادب کی گردنیں جھکادیں۔ اور میر صاحب کے علم کے نیچے ایک کرسی بچھا کر بٹھادیا۔ اس وقت دن ڈھل چکا تھا

اس وقت دن ڈھل چکا تھا اور ہال میں تل دھرنے کو جگہ باقی نہ تھی۔ فرش و کرسیوں سے لے کر گیلری اور چھت پر آدمیوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ چکے تھے کہ ایک حضرت اژدہام کو چیرتے شائقین کو دھکیلتے زبردستی اندر چلے آئے۔ دیکھا تو بہت بھاری بھرکم خواہ مخواہ مرد آدمی ہیں۔ جب گفتگو پر نوبت آئی تو معلوم ہوا کہ اردوئے معلیٰ اُن کی جاگیر ہے۔ نام و نشان کی جگہ فرہنگِ آصفیہ کی چاروں جلدیں نکال کر سامنے رکھدیں۔ سب نے محنت اور جانکاہی کی داد دی۔ نہایت قدر و منزلت کے ساتھ برابر میں بٹھالیا۔

اب محفل کا ڈھنگ بدلنا شروع ہوا۔ نکہت مغرب عجیب ساز و سامان ساتھ لائی تھی کہ اکثر کے لباس دیکھتے دیکھتے رنگ تبدیل کرنے لگے کہ اتنے میں ایک بہت بڑا عظیم الشان تعلیم یافتہ گروہ داخل دربار ہوا ان کے آنے پر تہذیب و تعلیم نے خوب خوب تالیاں بجائیں۔ یہ لوگ جب عین صدر میں پہنچے تو ایک ضعیف و کمزور جنٹلمین کو فوراً کندھوں پر اٹھالیا۔ وہ شخص عجیب و غریب مزاج رکھتا تھا۔ کبھی ہنستا تھا، کبھی فلاسفروں کی طرح سوچ بچار میں جا پڑتا تھا۔ کبھی آسمان کی

طرف دیکھتا۔ کبھی اپنے آپ کو دیکھ دیکھ کر کھلا جاتا تھا اور پھر ان سب بالوں کے باوجود دونوں ہاتھوں میں دو طپنچے لئے تھا اور سینکڑوں پیٹیاں کارتوسوں کی کمر سے باندھ رکھی تھیں۔ گھڑی گھڑی دونوں طپنچوں کو بھرتا اور پہلے آسمان کی جانب مارتا کہ یہ اہلِ مغرب کو لگیں گے مگر طپنچے سرسیّد کی طرف رُخ کرکے خالی کرتا باقی دھڑا دھڑ اپنے ہی گروہ پر خالی کئے جاتا مگر وہاں کچھ ایسی بے خبری کی شان نظر آرہی تھی کہ وہ تعلیم یافتہ گروہ جوان کو سر پر اٹھا کر لایا تھا اس نشانہ بازی سے زخمی ہوتا۔ مگر ٹس سے مس نہ ہوتا اور رندان کی طرف کبھی بھری ہوئی نگاہ سے دیکھتا۔ بلکہ ہر دم لحظہ بلحظہ زیادہ گرویدہ ہوتا چلا جاتا ان کے اس اندازِ رندانہ سے معلوم ہوا کہ حضرت اکبر الٰہ آبادی زبان اُردو میں نئے پھول کھلا کر آئے ہیں۔ سرسیّد نے گلے سے لگا لیا اور سامنے ایک صف میں ایک بلند جگہ پر لے جا کر بٹھا دیا۔ ان کے تشریف رکھتے ہی مغربی خاتونوں کی طرف سے ایک درخواست گذری کہ تمہارے اس فلسفی نے تمام عمر ہمارے خلاف زہر پھیلایا ہے۔ اس کو ایسے مقدس دربار میں اس قدر عزت نہ ملنی چاہئے مگر اس کا غذ

کی پشت پر مصلحتِ وقت اور اصلاحِ قوم لکھ کر واپس کر دیا کسی کو خبر تک نہ ہوئی۔

ابھی متانت اور سنجیدگی کے پُرزے ہوا میں اُڑ ہی رہے تھے کہ ایک طرف سے ایک اور بادل گرجا اور اس میں سے ایک کرشن کنیا ترکی ٹوپی پہنے اُٹھتے بیٹھتے لڑھکتے بھاگتے آئے۔ ہاتھ میں کچھ کتابیں بھی تھیں۔ مگر دیکھنے کی نوبت نہ آئی۔ زبانی ہی سب کچھ ادا ہو گیا انہوں نے پہلے مُنہ بسورا۔ پھر کھل کھلا کر ہنسے اور فرمایا کہ ابھی کیا ہے۔ گھڑی دو میں مُرلیا باجے گی۔ اس نرالی آواز کو سُن کر سب حیران ہوئے نقیب نے آواز لگائی۔ کہ حضرات مولانا رتن ناتھ سرشار ہی ہیں۔ سب خندہ پیشانی سے پیش آئے۔ مگر تصانیف کو دیکھ کر ان کی محنت پر افسوس ہی کیا۔

معلوم ہوا کہ یہ سب خلقت سمٹ کر اس قصرِ عالی شان میں آچکی ہے اور اب کوئی فرد ایسا باقی نہیں جو دربارِ شہرت میں آنے کا حق رکھتا ہو۔ اور کسی وجہ سے نہ آیا ہو۔ کہ اتنے میں دروازے پر ایک گروہ اور نازل ہوا کہ لباس فقیرانہ۔ انداز رندانہ۔ کلائیوں میں

لوہے کی چوڑیاں چھنکاتے ہاتھوں میں چھوٹے چھوٹے ڈنڈے بجاتے ۔ منہ سے طرح طرح کی نظمیں پڑھتے سارے مکان کو گھیرلیا ۔ دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ حضرت نظیر اکبر آبادی کے چیلے چانٹے ہیں ۔ انہیں شکایت ہے کہ ہم لوگ اور ہمارے پیشوا ملّا نظیر تمام دنیا میں قسم قسم کا فلسفہ اس بھیس میں پھیلاتے رہے ۔ مگر افسوس ہے آپ حضرات کی پہچان اور نا قدر شناسی پر کہ ایک دفعہ بھی ہمارا نام کسی کی زبان سے نہ نکلا ۔ ملّا تو آسمان تخیّل سے گزر کر فنا کی منزل میں جا نگزیں ہو گئے ۔ مگر ہماری شکایت برقرار ہے ۔ جب یہ خبر دارر ہا میں پہنچی تو سب نے افسوس کیا ۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا ۔ آب حیات ختم ہو چکا تھا ۔ دہیں کے کسی چشمہ سے پانی لے کر ملّا کے نام پر چھڑکا ۔ اور پھر انہیں کو واپس دے دیا ۔ کہ جاؤ ۔ پائے گدا لنگ نیست ملک خدا تنگ نیست ۔

آمد آمد شب کی خبر گرم تھی ۔ دن کا خون ہو چکا تھا ۔ فلک کجرفتار نے آفتاب کو چکرّ دے کر مغرب کے کونے میں

ذبح کر ڈالا تھا۔ جس کی چھینٹیں شفق بن بن کر گواہی کے لئے آ گئی تھیں۔ کہ شام کے چوبدار نے رات کی سواری دنیا کے دروازے پر لا کھڑی کی۔ پرندوں نے شاخوں پر شب نواز گیت گائے۔ درندوں نے رات کو آرام کے لئے چشموں کے کنارے ڈھونڈے۔ ملک شہرت کے ستاروں نے وہاں کی آخری محفل آرائی کے لئے اپنی آرائش کا سارا تھیلا الٹ دیا۔ مشرقی فانوسِ خیال میں مغربی بجلی نے روشن قمقمے بہم پہنچائے آس پاس کے سمندروں نے نسیم جانفزا کو ٹھنڈا کر کے ادھر کو بھیجا۔ غنچے مشک و عنبر گرا ہیں کھولنے لگے۔ سارا مکان ایک بقعۂ نور بن گیا تو کارپردازان مجلس نے دربارِ شہرت کی جلگمی کرسی سنگ مرمر کے تخت پر لا کر بچھا دی اور نہایت ادب و احترام سے آواز لگائی کہ صاحبِ صدر کا انتخاب کیا جائے۔ سب کی نگاہیں ایک دوسرے سے لڑیں۔ اور آپس کی کن انکھیوں میں باتیں شروع ہوئیں تو ہر طرف سے آوازیں آئیں کہ حضرتِ آزاد کو بلاؤ۔

وہ اب تک کیوں نہیں آئے۔ اب تو سب کو خیال ہوا۔ اور اُدھر سروں کو جنبش ہوئی تحقیق کرنے سے معلوم ہوا کہ اس مستانہ باغ میں گھستے ہی وہ ایک چھوٹے سے پارک میں چلے گئے وہاں جذب کی کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ اور استغراق کے نرگس کسی کے انتظار میں نگراں تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہیں محو ہو کر رہ گئے۔ یہ سنتے ہی اکثر درد مند اُدھر کو دوڑے اور حضرتِ آزاد کو سمجھا بجھا کر ادھر لے آئے۔

حضرتِ آزاد دور سے آتے دکھائی دئے۔ تو نثر کے علمبرداروں نے جھنڈے بلند کئے۔ انشا پردازی کے موروں نے پر پھڑائے خوشی کے نقارے پر چوٹ پڑی۔ نثر کی ٹکسال میں حضرتِ آزاد کے نام کے سکوں پر ضرب لگ گئی۔

سب اہلِ بزم دروازے تک استقبال کو آئے۔ خوش آمدید اور خوش آورد ید کے شور و لولے سنائی دئے۔ سب آنکھوں اور پلکوں پر اندر لائے تو پھر وہی صدر کا قصہ شروع ہوا سب کی نگاہیں حضرتِ سیّد پر پڑیں۔ مگر وہ اُٹھے۔ اور فرمایا۔

کہ اے میرے پرستارو۔ جو کچھ تمھارا خیال ہے وہ سب کچھ درست مگر حق یونہی ہے کہ اگرچہ ظاہرا حضرت آزاد مجھ سے سن و سال میں چھوٹے ہیں۔ مگر علم و فضل اور زباندانی و زباں آوری میں جو سنگلاخ میدان اُنہوں نے مارے ہیں۔ اور جو جو نظم کی دُشوار گذار گھاٹیوں کو چیر کر نئے انتظام کے ساتھ نظم کی تخم ریزی کی ہے اُس کی گرد کو بھی کوئی شخص نہیں پہنچ سکتا۔ اس لئے میں اپنے عزیز و محترم مولانا کو صدارت کا تاج پہنا کر اُردو کی شان کو دوبالا تا ہوں۔

یہ کہکر وہ آگے بڑھے اور مولانا کا ہاتھ تھام کر تخت پر بٹھا دیا۔ مولانا ایک خاص لٹک سنبھل کر کرسی پر بیٹھ گئے اور سب کی طرف محبت خیز نگاہیں ملائیں مگر مولانا شبلی نے کچھ ایسی چشمک سے نظر لڑائی کہ مولانا مسکرائے اور فرمایا کہ جو کچھ ہم کر چکے وہ ہو گیا ب تمہارے جوابوں سے وہ اثر تھوڑے ہی مٹ سکتا ہے۔ تم سے جو کچھ بن پڑا کم نہیں کیا اب ہر طرف سے تحسین و آفریں کی صدائیں پسند عام کے غلغلے بلند ہوئے۔ سونے ر چاندی کے پترے ہوا میں لرزتے ہوئے دکھائی دئیے۔ وہ رات سلطان آسمانی قدر رہائی کہ حکم ہوا کہ جو کچھ تم مانگ سکتے ہو مانگ لو۔ کہ آج کے لئے بہت بخشش اُٹھا رکھی ہے

اس پر حضرت آزاد نے مولانا شبلی کو مخاطب کیا اور فرمایا کہ خوش قسمت ہیں آپ کہ آپ نے بعد ایسے جانشین چھوڑے جنھوں نے آپ کے کام کو سنبھالا بلکہ اس میں اور ایسے ایسے اشخاص اُنہوں نے پیدا کر لئے کہ اب ہر شخص اپنی اپنی جگہ شبلی ہے مگر افسوس ہے ہمارے شاگردوں پر جو کچھ انہوں نے کیا ہمیں خوب معلوم ہے ہمارے فرزندان معنوی کیساتھ حسن سلوک تو کر نہیں رہے تھے کم از کم انہیں ذبح تو نہ کر ڈالتے مگر خدا کارساز ہے ما ستے بچا لیا اب غالب ہے کہ خدا اردو کی تصانیف کو جو اس اہل جلسہ کے بعد اُن کی نشانیاں دنیا میں باقی ہیں۔ قیامت تک نیست و نابود ہونے سے بچالے۔ بلکہ اُن میں اور ترقی کے راستے نکلیں

اب سُہانا وقت سحر قریب تھا۔ یہ باتیں ہو ہی رہی کہ اس فرشتۂ رحمت نے دو پھولوں کے ہار مہکتے اور لہکتے دامن سے نکالے اور ایک حضرت آزاد اور دوسرا مولانا شبلی کے گلے میں ڈالدیا۔ ان دونوں نے اُس کو دیکھا، سونگھا اور فرمایا کہ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے آنے کے بعد ہمیشہ تک یہ راستے چلتے رہیں اور یہ کام جاری رہیں اس لئے یہ ہار ہماری روشوں پر چلنے والوں کو دنیا میں پہنچا دئے جائیں تاکہ اس ہار سے خارہ کو اپنا دستور العمل بنا کر زبان اردو کی ترقی میں ہمہ تن کوشاں رہیں

اب مجھے خیال آیا کہ یہاں سے کوئی دنیا میں کا ہیکو جائیگا میں لیک کر یہ ہار لیلوں۔ اور ایک اعظم گڈھ پہنچا دوں اور دوسرا توڑ کر پنجاب میں پھیلا دوں جہاں اسوقت حیدرآباد کے بعد سب سے زیادہ اردو کی ریل دوڑی جارہی ہے اس ارادہ سے دونوں ہاتھ بڑھانا چاہتا تھا کہ ہاتھ آپس میں ٹکرائے اور آنکھ کھل گئی۔ دیکھا تو سحر

تھا خواب میں خیال کہ تجھ سے معاملہ   جب آنکھ کھل گئی تو زیاں تھا نہ سود تھا

دعا کا محتاج طاہر۔ نبیرہ حضرت آزاد
آزاد منزل لاہور
۲۷ مارچ سنہ ۱۹۲۳ء